جلد چہارم

تہذیب الاخلاق

یعنی مجموعہ مضامین

جناب نواب انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین صاحب و

مسٹر سید محمود صاحب بیرسٹرایٹ لا و

مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی و مولوی محمد ذکاءاللہ صاحب شمس العلما و

فارقلیط صاحب

مندرجہ تہذیب اخلاق ہفت سالہ

از ابتدائے ۱۲۸۷ھ ہجری لغایت ۱۲۹۳ھ ہجری مع دیباچہ

جسے

اللہ والے کی قومی دکان ملک چنن الدین خلف ملک فضل الدین تاجر کتب قومی

منزل نقشبندیہ کوچہ ککے زئیاں بازار کشمیری لاہور

نے

حجازی پریس لوہاری گیٹ باہتمام حافظ محمد اسمٰعیل چھپی

فہرست مضامین تہذیب الاخلاق جلد چہارم

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	تہذیب الاخلاق کی اشاعت کی ضرورت	۱
	مضامین مولوی مشتاق حسین صاحب انتصار جنگ بہادر	
۲	ہیئت جدیدہ	۵
۳	توکل	۶
۴	آب کام چہا کام	۱۱
۵	لنڈن میں عید الفطر کی نماز	۱۵
۶	شیریں زبانی	۱۶
۷	تقوے	۲۰
۸	سید محمد محمود صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ	۲۱
۹	اعتدال	۲۳
۱۰	عام محبت	۳۲
۱۱	مہمان و میزبان	۴۱
۱۲	انسان کی زندگی	۴۹
۱۳	تہذیب و شائستگی	۵۹
۱۴	مدرسۃ العلوم مسلمانان	۶۵
	مضامین سید محمد محمود صاحب	
۱۵	شدّتِ انقاع	۷۳
۱۶	دوستی کا برتاؤ	۷۶
۱۷	یونیورسٹی کیمبرج	۸۳
	مضامین مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی	
۱۸	انبیاء	۹۱
۱۹	زمانہ	۹۹
	مضمون فارقلیط اللہ	
۲۰	مباحثہ	۱۰۹
	مضمون مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب	
۲۱	ریویو	۱۲۰

دیباچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تہذیب الاخلاق کی اشاعت کی ضرورت

جن لوگوں نے خواجہ نصیر الدین طوسی کی کتاب اخلاق ناصری پڑھی ہے۔ وہ اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ تہذیب الاخلاق کیا کتاب ہے۔ اور حکمائے کرام و علمائے عظام کی مجلس میں وہ کیسی عزت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے لیکن جن لوگوں کو اخلاق ناصری کے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ہم ان کو بتلائے دیتے ہیں کہ آج سے قریباً نو سو برس پیشتر ترکستان کے شہر رَے میں جو ایک حکیم فاضل اور استاد کامل ابو علی مسکویہ خازن رازی گزرا ہے یہ اس کی تصنیف ہے اس کتاب نے مضامین کی عمدگی۔ بیان کی خوبی زبان کی خوش اسلوبی کی وجہ سے ایسا حسن قبول حاصل کیا تھا۔ کہ خواجہ نصیر جیسے شخص نے جو اپنے زمانہ کا ایک مامور اور مشہور فاضل تھا۔ جب قہستان کے حاکم امیر ناصر الدین۔ عبدالرحیم کی پاس خاطر کتاب اخلاق ناصری مرتب کی۔ تو فن اخلاق کے متعلق صرف اسی کتاب کے ترجمہ پر اکتفا کیا اور کسی جدید کتاب کے تصنیف کرنے کی ضرورت نہ سمجھی +

جس زمانہ میں یہ کتاب تصنیف ہوئی۔ اسلامی سلطنت کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ گھر گھر علم و فضل کا چرچا تھا۔ رعایا اس کو ترقی مدارج کا ذریعہ سمجھتی تھی۔ حکام اپنی سلطنت کی زیب و زینت کا باعث تصور کرتے تھے اور تو اور صرف ابو علی سینا اور ابو ریحان بیرونی اس حکیم کے ہمعصروں میں دو ایسے باکمال گزرے ہیں۔ جن کا نام ایشیا اور افریقہ کی اسلامی قوموں میں عموماً اور یورپ کے تہذیب یافتہ ملکوں میں خصوصاً نہایت عزت اور توقیر کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ بہ زمانہ

تھا کہ فاتح اور مفتوح قوم کی زبان۔ تمدن۔ معاشرت۔ علوم وفنون۔ حرفت وصنعت۔ میں کسی قسم کی مغائرت نہ تھی۔ اس واسطے حکیم مذکور نے اس امر کو کافی سمجھا کہ وہ اپنی کتاب میں صرف نفس ناطقہ کی صفات سے بحث کرے اور اُس کے فضائل اور رذائل کے بیان سے اُس کو مکمل کرے۔ لیکن اگر ابو علی ہمارے زمانہ میں ہوتا اور دیکھتا کہ فاتح اور مفتوح قوم کی زبان میں اختلاف۔ دونوں قوموں کے تمدن اور معاشرت کا طریق جُدا۔ ایک قوم کے علوم وفنون دوسری قوم کے علوم وفنون کے مقابلہ میں مثل تقویم پارینہ۔ حرفت اور صنعت کا یہ حال کہ تکلفات کی چیزیں تو بجائے خود رہیں۔ چاقو۔ قینچی۔ بلکہ سوئی دھاگہ تک جو ہمارے روز مرہ کے استعمال کی چیزیں ہیں۔ ہم اُس میں غیر قوموں کے محتاج۔ تو کیا ان حالات پر یہ ممکن تھا کہ وہ علاوہ مضامین مذکورہ بالا کے ایسے مضامین درج نہ کرتا۔ جو قوم کو تاریکئی جہالت کے تنگ گڑھے سے نکلنے اور ترقی کے نورانی میدان میں قدم رکھنے کا ذریعہ ہوتے۔

خدا کا شکر ہے کہ جب ایسی کتاب کی ضرورت پیش آئی تو اس نے اپنے فضل وکرم سے ہمارے زمانہ کے مناسب حال ایک اور ابو علی کو پیدا کر دیا۔ جو رسائی عقل اور صفائی ذہن کے باعث قوم کی ضروریات سے۔ زمانہ کی رفتار سے۔ ترقی کے موانعات اور اس کی اصلاح کی تجاویز سے ایسا ہی آگاہ ہے۔ جو ایک مصلح قوم اور بہی خواہ ملک کو ہونا چاہئے وہ کون؟ آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خان بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل۔ ایل۔ ڈی۔ اس مرد خدا نے جب سے دنیاوی زندگانی میں قدم رکھا اور قوم کی موجودہ حالت کو دیکھکر معلوم کیا۔ کہ یہی ہے کہ ایک زمانہ میں علم وفضل۔ حرفت وصنعت۔ تجارت وحکمرانی میں ترقی کرکے اعلےٰ درجہ پر پہنچی ہوئی تھی۔ یا اب وہی قوم ہے کہ ترقیات کو اُس سے ایسی مغائرت ہے جو ایمان کو کفر سے۔ یا نور کو ظلمت سے۔ یا آبادی کو ویرانہ سے۔ تو ان حالات سے اُس کا جی بھر آیا اور ہمہ تن اُس کی حل مشکلات میں مصروف ہو گیا۔ اور جو کچھ ہو سکتا تھا برسوں اُس پر سوچا کیا دل اور دماغ سے قلم اور زبان سے۔ مال اور جان سے جو مدد مل سکتی تھی۔ وہ ساری اُس پر صرف کر دی۔ اور آخر کو ایک سوسٹی قائم کی۔ اخبار جاری کیا۔ علمی کتابوں کے ترجمے کرا کر شائع کئے۔ مگر جب تھوڑے عرصہ کے تجربہ سے اس کو معلوم ہو گیا۔ کہ یہ تدبیریں موجودہ حالات کے لحاظ سے غیر تسلی بخش اور ناکافی ہیں۔ تو فاتح قوم کے عروج اور اقبال مندی کا زندہ نمونہ دیکھنے کے واسطے لندن تک کا سفر اختیار کیا۔ اس کے حالات کو نظر عبرت

سے دیکھا۔ اُس کی ترقی کے اسباب کو جانچا پھر ان سب اسباب کا موازنہ اپنی قوم کے حالات سے کیا۔ اور اس تمام تر سفر کا نتیجہ یہ نکالا کہ "جو قوم دوسری قوم کے ماتحت رہ کر ترقی کرنا چاہتی ہے۔ عزت اور آرام سے زندگی بسر کرنے کی خواہشمند ہو غیر قوموں کے سامنے اولوالعزمی کا پھریرا بلند کرنا اُس کے مدنظر ہو اس کو لازم ہے کہ فاتح قوم کی زبان اور اُن علوم کو سیکھے۔ جو دنیا میں مفید اور بکار آمد ہوں۔ اور ایک قومی دارالعلوم قائم کرے۔ جو اس ضرورت کے انصرام کا کفیل ہو"

اب اِس بزرگوار نے ہندوستان میں واپس آکر چاہا کہ جو تجارب عظیمہ اس لیے چوڑے سفر میں حاصل کئے ہیں۔ قوم کو اُن سے آگاہ کرے۔ مگر قوم کو دیکھا کہ قومی سلطنت کا سایہ اُٹھ جانے سے علوم وفنون کی تحصیل چھوڑ بیٹھنے سے اُس پر ادبار چھا گیا ہے۔ خواب غفلت میں پڑی اینڈ رہی ہے۔ نہ سرسری پکار سے اُس کی آنکھ کھلتی ہے۔ اور نہ معمولی جھنجوڑ سے کروٹ بدلتی ہے۔ تب ایک شیریں کلام۔ بلند آواز۔ اُن تھک طبیعت کو اُس پر متعین کیا اس کی سریلی آواز میں وہ غضب کی طاقت تھی۔ کہ جس دل میں گئی جادو کی طرح اثر کر گئی جس گھر میں پہنچی مقناطیس کا کام کر دکھایا۔ سوتوں کو جگایا۔ مستوں کو ہوشیار کر دیا۔ مردہ تنوں میں رُوح پھونک دی۔ زندہ دلوں کو روح القدس کا اثر عطا کیا۔ وہ شیریں کلام کون تھا؟ مقدس تہذیب الاخلاق۔ جس کی اشاعت کا انتظام درپیش ہے +

آہا!! یہ وہی تہذیب الاخلاق ہے:-

جس نے مسلمانوں کی حسن معاشرت کا بیڑا اُٹھایا +

جس نے اسلامیوں کے اصلاح تمدن کا بار گران اپنے ذمہ لیا +

جس نے پاک مذہب سے رسم ورواج کے اوہام باطلہ کو دُور کر دیا +

جس نے دنیا کو بتادیا کہ سچا اسلام ہر قسم کی دینی و دنیاوی ترقیات کرنے کو بہمہ وجوہ آمادہ ہے +

جس نے غیر مذہب والوں پر ثابت کر دیا۔ کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو انسانی فطرت کے مطابق ہے +

جس نے عام وخاص پر ظاہر کر دیا۔ کہ مصلحان بنی آدم میں سے جس کی شریعت دنیا کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے وہ نبی عرب محمد صلعم کی ذات بابرکات ہے +

ہاں کتاب تو ایسی ہی ہے۔ مگر اب کہاں۔ کچھ تو پہلے ہی گنتی کے نسخے چھپا کرتے تھے اور اب بیس برس کی مدت نے اُن کو اور نایاب کر دیا۔ اگر کہیں اتفاقیہ بکتی ہوئی مل بھی جائے۔ تو پھر عام کو اس کی خریداری اور نفیس طبائع کو اس کی گرانباری متعذر۔ غریب آدمی ۱۸ روپیہ کہاں سے لائے۔ اور امیر آدمی اُس کی سات جلدوں کی ورق گردانی کا کس طرح متحمل ہو۔ پس سہولت اس کی مقتضی ہوئی ہے کہ کُل اولڈ اڈیشن (عہد عتیق) چار حصوں میں شائع کیا جائے۔ اور ہر حصہ کی قیمت دو روپے قرار پاوے۔ ترتیب مضامین کے لحاظ سے تفصیل حصص یوں ہے :-

پہلے حصہ میں نواب محسن الملک محسن الدولہ مولوی سید مہدی علی خاں صاحب بہادر منیر نواز جنگ کے مضامین۔ قیمت تین روپے (۳ ر)

دوسرے حصہ میں عالیجناب آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں صاحب کے سی ایس۔ آئی۔ کے کُل مضامین۔ قیمت تین روپے (۳ ر)

تیسرے حصہ میں نواب اعظم یار جنگ مولوی محمد چراغ علی خاں صاحب بہادر مرحوم کے مضامین۔ قیمت (۸ ؍)

چوتھے حصہ میں نواب انتصار جنگ مولوی مشتاق حسین۔ سید محمد محمود۔ مولوی الطاف حسین حالی۔ فارقلیطہ اللہ۔ شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ وغیرہ صاحبان کے مضامین۔ قیمت (۱۲ ر)

خادم قوم

خاکسار ملک فضل الدین ککے زئی تاجر کتب قومی و مالک اخبار اشاعت

لاہور۔ بازار کشمیری

مضامین مولوی مشتاق حسین صاحب انتصار جنگ بہادر

ہیئت جدیدہ

ہیئت جدیدہ اور معجزہ قرآنی

جس وقت ماہیت موجودات سے بحث کی جاتی ہے اُس وقت میں یہ کہنا بالکل فضول ہوتا ہے کہ متقدمین نے اُس کی نسبت ایسا اور ایسا کہا ہے. خواہ اُن متقدمین میں کوئی بڑے سے بڑا حکیم اور نہایت سے نہایت دانا ہی آدمی کیوں نہ ہو. علیٰ ہٰذا القیاس ایسے مقام پر نہ کسی مفسر کا قول معتبر ہو سکتا ہے نہ کسی محدث کا. اور جبتک علم مناظر اور مرایا ہی کے ذریعہ سے اشیائے موجودہ کی حقیقت کو ثابت یا باطل نہ کر دیں تب تک لب ہلانے کا موقع بھی نہیں ملتا. اور یہ ایک ایسا مسلمہ اصول ہے کہ متقدمین اور متاخرین اہل اسلام رضی اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین کا عملدرآمد برابر اسی پر چلا آیا یہانتک کہ اگر بعض آیات قرآن شریف اور احادیث کے ظاہری اور لغوی معنی بادی النظر میں اُن کو صور محسوسات اور موجودات کے خلاف معلوم ہوئے تو انھوں نے ان آیات اور احادیث کی تاویل ہی کی اور یہ نہ کہا کہ نہیں جناب باری نے یوں فرمایا اور حدیث میں یہ آیا ہے اس لئے کہ ایسا کہنے ہیں اُن لوگوں کی نظروں میں جو موجودات کی ہیئت کو اچھی طرح تحقیق کرنا چاہتے ہیں. مذہب اسلام کا ضعف ثابت ہوتا اور چونکہ اعمال کا ثمرہ نیت پر منحصر ہے اور اُن تاویل کرنیوالے مصنفوں کی نیت نہایت نیک تھی اس لئے خدا سے امید ہے کہ اگر کوئی غلطی بھی ان سے کسی تاویل میں ہوئی تو اُس پر اُن سے مواخذہ نہ ہوگا*

لیکن چند روزوں سے ہندوستان میں ہمارے مسلمان بھائیوں کا ایسا حال ہوگیا ہے کہ جو بات کسی مفسر یا محدث یا فقیہ نے خود اپنی رائے اور اپنے قیاس سے کسی کتاب میں لکھدی گو وہ کیسی ہی ضعیف کیوں نہ ہو. اور گو زمانہ حال کی تحقیقاتوں کے لحاظ سے وہ کیسی ہی خلاف قیاس کیوں نہ ہو اور گو اور مفسرین اور محدثین وغیرہ نے اس سے اختلاف ہی کیوں نہ کیا. مگر مسلمانوں کی یہ جرأت نہیں ہوتی کہ کسی مولی کتاب

کی لکھی ہوئی بات کے خلاف کچھ کہہ سکیں۔ اور رفتہ رفتہ اُن کی احتیاط نے یہاں تک اُن کو مجبور کیا۔ کہ مولود شریف وغیرہ کتابوں کا لکھا ہوا بھی اُن کے ایمان اور اعتقاد کا ایک جزو ہو گیا۔ کسی کی یہ ہمت نہیں ہوتی کہ اُس کے خلاف پر کچھ کہہ سکے۔ اور اگر کسی نے ایسا ارادہ کیا تو بے تکلف کفر اور الحاد کے فتوے اُس سے منسوب ہوتے ہیں +

ہم دیکھتے ہیں کہ الٰہیات کے علاوہ بہت ایسے علم ہیں کہ اُن کی تحقیقات اور تلاش اور صحت اور تکمیل کو خدا تعالےٰ نے بالکل انسان کی کوششوں پر ملتوی رکھا ہے مثلاً ہیئت اور طبعیات وغیرہ صدہا علم اسی قسم کے ہیں جن کے واسطے نہ آج تک کوئی نبی اُن کی تعلیم کے واسطے مبعوث ہوا نہ کوئی کتاب اس فن خاص میں خدا تعالےٰ نے آجتک کسی نبی پر نازل کی قرآن شریف میں یا حدیث میں ہیئت یا طبعیات کے متعلق کہیں کسی چیز کا نام آگیا کہیں بر سبیل تذکرہ اور کہیں عام لوگوں کے فہم کے لائق کسی چیز کا کوئی مختصر بیان ہو گیا کہیں کوئی مجمل اشارہ کسی چیز کی طرف ہوا مگر حاشا کہ کسی مقام پر بھی اُن بیانات سے یہ بات مقصود بالذات مدِ نظر نہیں ہوئی۔ کہ اُن کے ذریعہ سے عامہ خلائق کو ہیئت اور طبعیات کے علم کی تعلیم دیجائے کما قال اللہ تبارک و تعالےٰ۔ ویسئلونک عن الاھلۃ۔ یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگ تجھ سے مہینوں کی حقیقت دریافت کرتے ہیں۔ اور پھر فرمایا کہ قل ھی مواقیت للناس یعنی کہدے کہ مہینوں کے ذریعہ سے لوگ اپنے وقتوں کا حساب ٹھیک کر لیتے ہیں آج کسی ادنےٰ ہیئت دان سے اھلہ کی کیفیت دریافت کیجئے پھر دیکھئے کہ وہ کیسے زمین اور آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ حساب کے معاملہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا۔ اور اُس وقت میں اُس پر فخر کیا کہ ہم گنتی کو انگلیوں پر ٹھیک کر لیتے ہیں حاصل یہ ہے۔ کہ اُس وقت میں حساب ریاضی اور طبعیات وغیرہ کی طرف کسی کو مطلق التفات بھی نہ تھا +

پس مسلمانوں کو مناسب ہے۔ کہ اس نکتہ پر اچھی طرح غور کریں اور قرآن و حدیث کو ہیئت و ہندسہ اور طبعیات کیواسطے میدان مناظرہ نہ قرار دیں اور حقیقت موجودات کو گذشتہ منقولات سے باطل کرنیکے خیال خام میں نہ پڑیں۔ اور جو تاویلات مفسرین اور محدثین نے حقیقت موجودات کے باب میں وقت کی ضرورت سے کی ہیں اُن کو ہر وقت کی ضرورت کے لحاظ سے غور کی نگاہ سے دیکھیں اور جیسا اس میں شبہ نہیں کہ قرآن خدا کا کلام ہے ویسا ہی اس میں بھی شبہ نہیں کہ اللہ کا کلام کسی حقیقت نفس الامر کے خلاف بھی نہیں ہو سکتا۔ اور بیشک مسلمان اگر تحقیق کو کام فرماویں تو انکو اس بات پر فخر کرنیکا موقع مل سکتا ہے کہ خدا تعالےٰ نے اپنے نبی کے ذریعہ سے اُن پر کیسا کلام معجز نظام نازل کیا جس کا معجزہ ہر وقت

میں تازہ ہے مندرجہ ذیل مثال سے اس دعوےٰ کی بخوبی تصدیق حاصل ہوتی ہے۔

جس وقت کلام اللہ نازل ہوا۔ تمام دنیا میں یونانیوں کی ہیئت کے یہ مسئلے جاری تھے کہ ستارے آسمانوں میں جڑے ہوئے ہیں اور آسمانوں کی حرکت کے ساتھ ستاروں کو بھی گردش رہتی ہے چنانچہ ابتک بھی مسلمانوں کی عربی تعلیم میں وہی مرغی کی ایک ٹانگ بڑھائی جاتی ہے اور اسی ستاروں کی حرکت تابع حرکت آسمان ہونیکے باب میں سینکڑوں بیجا اور پوچ دلیلیں لائی جاتی ہیں۔ اور جب کوئی نئی چال کا ستارہ نیا دریافت ہوتا ہے اس کے لئے ایک بڑا مجسم فلک بغیر دیکھے بھالے اور سمجھے بوجھے ماننا پڑتا ہے۔ اور چونکہ زمانہ نزول قرآن میں کوئی شخص اس بات کا قائل نہ تھا اور نہ لوگ اس بات کو جانتے تھے کہ سارے معلّق ہیں اور ہر ایک اُن میں سے جُدا جُدا دورہ طے کرتا ہے اسی واسطے قرآن شریف میں جہاں کہیں ستاروں کی گردش کا کوئی اتفاقیہ ذکر آگیا مفسرین نے اس کی تاویل اُسی مروجہ ہیئت کی تطبیق کی نظر سے کی اور بمجبوری اس بات کو تسلیم کیا کہ ستاروں کی حرکت اس موقع پر ذاتی مراد نہیں بلکہ اُن کی حرکت آسمانوں کی حرکت کے تابع ہے۔

لیکن خدا غریق رحمت کرے مولوی عبد القادر صاحب دہلوی کہ انہوں نے جب کلام اللہ کا ترجمہ لکھا۔ اور اس مقام پر پہنچے وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ[1] تو یہ لفظی ترجمہ تحریر فرمایا۔ کہ ہر کوئی ایک ایک گھیرے میں پیرتے ہیں۔ اور حاشیہ پر صاف یہ لکھا:۔

"ستارہ ایک ایک گھیرا رکھتا ہے اُسی راہ پر تیرتا ہے معلوم ہوا کہ ستارے آپ چلتے ہیں۔ یہ نہیں کہ آسمانوں میں گڑے ہیں۔ اور آسمان چلتا ہے نہیں تو پیرتا نہ فرماتے"۔

اور اس طرح پر تمام تفسیروں کو بالائے طاق رکھدیا اور یونانیوں کی ہیئت کے ایک بڑے حصّہ کو اپنے خدا کے سچے کلام کے سامنے پس پُشت ڈالدیا اور اُن تمام مباحثوں کو بھی ختم کردیا جو اس مقام پر ایک بیجا تاویل کے سبب سے اُستادوں اور طالب علموں میں پیش آتی ہیں۔ اور اس بات کی ہرگز پروا نہ کی کہ مسلمان مجھ کو اور مفسرین سے اختلاف کرنے کے باب میں کیا کہینگے۔

اب اس بات سے قطع نظر کرو کہ بطلیموس نے کیا کہا فیثاغورث کس طرف گیا بلکہ جناب باری کے کلام پر بغیر کسی تاویل کے نظر ڈالو تو کچھ شک نہیں رہتا کہ مولوی عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو معنی اور مطلب اس مقام پر بیان کیا وہ آیت سے کیسی کچھ مناسبت رکھتا ہے بلکہ درحقیقت اسکے سوا اور کچھ معنی اس آیت کے ہو نہیں سکتے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ جدید ہیئت کہ تمام ستارے ایک ایک مرکز کے گرد

---

[1] پارہ ۲۳۔ رکوع ۲۔ سورہ یٰسٓ۔

گردش کرتے ہیں۔ اور اپنا دائرہ پورا کرتے ہیں اور اُن کی حرکت کسی فرضی آسمان کے تابع نہیں ہے نزول قرآن سے بہت صدیوں بعد شائع ہوئی ہے۔ تو یہ بات بہت صفائی اور استحکام کے ساتھ قائم ہوتی ہے۔ کہ جو بات آج ہزاروں طرح کی دقتیں اٹھا کر اور مشکلات حل کر کے رصدگاہیں بنا کر آلات درست کر کر بڑی بڑی جانکاہیوں کے بعد انسان کو تحقیق ہوئی وہ ایک مدت دراز ہوئی جو خدا نے اپنے نبی برحق سے اور اُن کے واسطے سے تمام مسلمانوں سے صاف صاف ارشاد فرمادی تھی اور جس کی صحت اور اصلیت سے یونانیوں کی مغالطہ دہی کے سبب سے ہم ناواقف رہے۔ پس یہ ایک بڑی سند اس بات کی ہے کہ جس خالق نے ستاروں کو اور ان کی گردشوں کو پیدا کیا اُسی کا یہ پاک کلام ہے جو اُس کے نبی پر نازل ہوا اور بیشک خدا کا کام اور خدا کا کلام مخالف نہیں ہو سکتا اب ہم دریافت کرتے ہیں کہ یہ قرآن شریف کا کیسا معجزہ ہے۔ جس سے مسلمان درکنار کسی مذہب کا انصاف دوست آدمی بھی انکار نہیں کر سکتا ÷

جس غرض سے ہم نے اس مضمون کو لکھنا شروع کیا تھا اس کو ہم بالفعل اسی پر ختم کرتے ہیں۔ لیکن ایک اور نہایت عمدہ نصیحت جو ہم کو اس مضمون کے لکھنے سے حاصل ہوتی ہے اس کے ظاہر کرنے سے بھی ہم باز نہیں رہ سکتے ÷

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں جس میں ہم موجود ہیں لوگ تفسیر وغیرہ کے ایک فقرہ سے بھی تجاوز کرنیکو معصیت یا قریب معصیت سمجھتے ہیں اور پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مولوی عبدالقادر صاحب نے خدا اُن کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عنایت کرے آتنا بڑا اختلاف کیا اور ایک ایسے مسئلہ کو توڑا جو بہت سی صدیوں سے مسلم اور متفق علیہ چلا آتا تھا۔ اور باینہمہ میاں صاحب مرحوم کا کسی کو شاکی نہ پایا۔ تو اِن نیک نیت مسلمانوں کی کوششوں کی ناکامیابی پر افسوس ہوتا ہے جو زمانہ حال کی تحقیقاتوں کے لحاظ سے اسی قسم کے اور خیالات رکھتے ہیں۔ اور لوگوں پر اصل حقیقت کا منکشف کرنا چاہتے ہیں پس ہر طرح کی فکر اور غور کے بعد ہم کو کچھ کچھ ہر ایک فریق کی کارروائی میں قصور معلوم ہوتا ہے۔ ہمارا کام تو حقیقت میں یہ ہونا چاہئے کہ جو بات ہم کسی سے سنیں اُس کو انصاف کی نظر سے دیکھیں اور تعصب اور پابندی رسوم بیجا کے لحاظ سے اس سے متنفر نہ ہوں ÷

مرد باید کہ گیرد اندر گوش ورنوشتست پند بر دیوار

لیکن اس میں بھی شبہ نہیں اور درحقیقت ایک قدرتی بات سی ہو گئی ہے کہ ناصح کے چال وچلن کو بھی نصیحت کے مؤثر یا غیر مؤثر ہونے میں بڑا دخل ہے پس ان لوگوں کو بھی جو صدق دل سے مسلمانوں کو

راہ صواب پر لانا چاہتے ہیں۔ اور ہر وقت اُن کی اصلاح اور فلاح میں مستغرق رہتے ہیں۔ یہ بات نہایت ضرور بلکہ فرض ہے کہ اپنا برتاؤ بھی وہ ایسا سنجیدہ رکھیں جس سے عوام متنفر نہ ہوں۔ اور خواص کو محل شکایت نہ رہے اور یہ بات ایک مسلمان ناصح کو ہر طرح پر نصیب ہو سکتی ہے۔ کہ جو باتیں خدا تعالیٰ نے اس پر مثل نماز و روزہ وغیرہ کے فرض کر دی ہیں۔ اور جو عمدہ اصول مذہب اسلام میں ان کے واسطے ہزاروں لاکھوں مصلحتوں کے لحاظ مثل جمعہ اور جماعت وغیرہ کے قائم ہوئے ہیں۔ اُن کے ادا کرنے میں کاہلی کو کام نہ فرماویں اور جو کچھ کریں صدق دل سے بغیر ریاکاری کے کریں تاکہ خود بھی معصیت سے بچیں۔ اور جن عمدہ باتوں پر وہ اپنی قوم کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں اُس میں کامیاب ہوں*

توکّل

جن باتوں سے کسی قوم پر ادبار آتا ہے۔ اور تمام ہمتیں پست اور قوتیں سست ہو جاتی ہیں اُن میں جہاں عام رسم و رواج کی پابندی اور جاہلانہ تقلید اور اپنے آپ کو ہمہ داں اور سب سے برتر سمجھنا اور تعصّب بیجا اور اور اسی قسم کی خرابیاں شامل ہیں۔ اُن میں ایک حضرت توکّل بھی ہیں جن سے خدا پناہ میں رکھے آج کل عرف میں جس کا نام توکّل ہے وہ ایک ایسی بیماری ہے جس کا مریض کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ وہ زہریلا اژدہا ہے جس کا کاٹا پانی نہ مانگے اچھا خاصا صحیح و سالم اور تندرست انسان جس کو خدا نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ توکّل کی شامت سے دن بدن ایسا زار و نحیف ہوتا چلا جاتا ہے کہ پھر اُس کی اصلاح ناممکن ہو جاتی ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہندوستان کے مسلمان بھائی بھی اس آفت میں مبتلا ہیں*

ہندوستان میں ہزاروں مسلمان ہر شہر اور گاؤں میں ایسے ہیں کہ جب اُن سے مسلمانوں کی اصلاح اطوار و اوضاع میں اس غرض اور نیت سے گفتگو کی جاتی ہے کہ یہاں کے موجودہ مسلمان بھی کیوں اپنی ترقی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور کیوں ایسی کوششیں نہیں کرتے جیسے اُن کے اگلوں نے کی تھیں اور جو اب بھی اُن کے بھائی مصر اور ٹرکی بلاد اسلام میں کر رہے ہیں۔ اور جو خراب رسم و رواج ہندوستان کی قدیمی قوموں کی شامت اعمال سے اُن میں مل جُل گئے۔ کیوں ان سے کنارہ کش نہیں ہوتے تاکہ وہ بھی دنیا میں ایک مہذب قوم کہلاویں اور مرنے کے بعد اپنا مقدّس اور پاک اور خالص مذہب اپنے ساتھ لیجاویں اور دونوں جہان کی بھلائی حاصل کریں۔ تو ان سب تقریروں کا جواب یہی ملتا ہے کہ "میاں یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ کسی کے کئے سے کچھ نہیں ہوتا خدا کو اگر منظور ہے کہ مسلمانوں کی عزت ہو تو ہر حال میں اُن کی عزّت ہوگی۔ اور اگر اس کو اُن کا ذلیل ہی کرنا منظور ہے تو لاکھ کوئی پیروی کرے مگر

کیا ہوتا ہے۔ اپنا تو خدا پر توکل ہے ؎

اس میں کچھ شک نہیں کہ جیسا انہوں نے خیال کیا ہے ہوگا وہی۔ ع

بے رضائے تو یکے برگ نہ جنبد ز درخت

لیکن چونکہ انجام کا حال کسی کو معلوم نہیں اور یہ بات بھی انسان پر فرض ہو گئی ہے کہ اپنے حال کی اصلاح میں جہاں تک ممکن ہو کوشش سے دریغ نہ کرے۔ اس لئے ان متوکلوں کا یہ گمان اس بات کے لئے کافی حجت نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی اور اپنے بھائیوں کی اصلاح حال میں بھی کوشش نہ کریں اس لئے کہ اس کا نام توکل نہیں ہے بالکل یہ محض ایک دھوکہ ہی دھوکہ ہے مسلمانوں کے مذہب میں ایسے توکل کی کہیں اصل پائی نہیں جاتی اور نہ خدا نے مسلمانوں کو ایسے لغو توکل کی اجازت دی توکل جو مسلمانوں کے مذہب میں ہے وہ یہ ہے۔ کہ انسان اپنی عقل اور طاقت کے موافق اپنے کاموں کی تدبیر کرے اور یہ یقین کر لے کہ یہ تمام تدبیریں کارگر اسی وقت میں ہوں گی جبکہ خدا چاہیگا۔ ع

بر توکل زانوئے اشتر بہ بند

انسان عالم اسباب میں پیدا کیا گیا ہے۔ جہاں تمام کارخانہ اوّل سے آخر تک بالکل اسباب پر قایم ہے۔ اور باوجود اس کے کہ خدا تعالےٰ جس کام کو چاہے بغیر اسباب کے موجود کر دیوے اس کی عادت اس عالم میں اکثر اسی طرح جاری ہے۔ کہ تمام کاموں کے واسطے جو اس کو کرنے منظور ہوتے ہیں مختلف اسباب پیدا کر دیتا ہے جس کی بے انتہا مثالیں ہر لحظہ اور ہر ساعت ہماری نظروں کے سامنے سے گذرتی چلی جاتی ہیں۔ پس تمام نظام عالم ہم کو اس بات پر مائل کرتا ہے۔ کہ اس عالم میں ہم کو بھی جو کام کرنا ہو اوّل ہم اس کے اسباب درست کرنے کی فکر کریں۔ اور پھر اس کے نتیجے کو خدا پر منحصر کریں۔ آدمی کے تمام قویٰ اور ترکیب اعضا اور حواس اور دل اور دماغ وغیرہ جس طرف خیال کیجئے سب اس بات پر شاہد ہیں۔ کہ بے شک و شبہ آدمی کو اپنے ہر کام کا سامان خود درست کرنا چاہیئے اور ایسا نہ کرنے میں تمام وہ قوتیں عقلی اور جسمانی جو خدا نے انسان کو عطا فرمائی ہیں محض باطل اور لغو ہوئی جاتی ہیں جس سے خدا کی صاف ناشکری نکلتی ہے پس بلا لحاظ اس بات کے کہ کل کو خدا کیا کریگا۔ آج ہم کو اپنے کاموں کے واسطے سامان درست کرنا چاہیئے۔

دیکھو باوجود اس بات کے کہ خدا نے اپنے سچے نبی کی زبان پر اس بات کا وعدہ فرما دیا تھا کہ لوگ کیسے ہی مزاحم کیوں نہ ہوں لیکن یہ مذہب اسلام مشارق اور مغارب میں روشن ہو کر رہیگا چنانچہ وہی آخر کار ہوا۔ لیکن باایں ہمہ رسول خدا اور اصحابہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے پھیلانے میں

کیسی کیسی کوششیں اور عرق ریزیاں کیں اور کیسی کیسی کٹھن مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلیں جن کا بیان نہیں ہوسکتا اور جو تمام مسلمانوں پر بخوبی روشن ہیں، پھر کیا کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے۔ کہ اُن بزرگواروں میں توکل نہ تھا یا اُن کی یہ کوشش توکل کے منافی تھی نہیں ہرگز نہیں پس ہماری آرزو اور خواہش اپنے ہندوستان کے مسلمان بھائیوں سے یہ ہے کہ وہ اُس لغو توکل کو دل سے دور کر دیں جس کو شیطان نے لوگوں میں اُن کی ہمتیں اور قوتیں پست کردینے کی غرض سے پھیلا دیا ہے۔ اور سچا توکل اختیار کریں اور جو بات اُن کو اپنی دنیا اور دین کی بھلائی کی معلوم ہو۔ اُس میں حتی الامکان بجان و دل سے کوشش کریں اور تمام تر اپنی ہمتوں اور مالی و بدنی کوششوں کو اُسی طرف مصروف کریں جس سے مسلمانوں کی قوم اور اُن کے مذہب کا تمام لوگوں کی نظروں میں ایک اعتبار اور وقعت پیدا ہو جاوے اور اسلام کی سچی شعاعوں سے تمام ہندوستان منور ہو جاوے اور جس طرح اُن کے بھائی ٹرکی میں اور مصر میں قومی ترقی اور قومی فخر اور قومی عزت اور امتیاز حاصل کرنے میں کوشش کر رہے ہیں۔ وہ بھی اُس سے غافل نہ ہوں +

وعلی اللہ فلیتوکل المتوکلون۔ ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار۔ آمین ثم آمین۔ اللّٰھم آمین

آپ کام مہا کام

اپنے کرنے کے کام کو گورنمنٹ پر ڈالنا خوب نہیں

بلاشبہ ہر ایک منصف گورنمنٹ کا یہ فرض ہے کہ اپنی رعایا کے کاموں میں جہاں تک اُس سے ممکن ہو مدد کرے لیکن یہ ناممکن ہے کہ رعایا خود اپنی بھلائی کے کاموں میں مطلق کوشش نہ کرے اور شہر یک نہ ہو اور وہ تمام ذمہ داری گورنمنٹ کے ذمہ ہے اور گورنمنٹ اس کا سرانجام کر سکے یہ بات کچھ ہندوستان ہی کی گورنمنٹ پر منحصر نہیں بلکہ تمام دنیا کی گورنمنٹوں کا یہی حال ہے۔ اور درحقیقت خداوند تعالےٰ نے گورنمنٹ اور رعایا کو دنیا کے قدرتی انتظام کے بناؤ کے واسطے مثل دو ہاتھوں کے بنایا ہے جس ملک کی رعایا ہر طرح پر شائستہ اور تربیت یافتہ اور اپنی عادل گورنمنٹ کی خیر خواہ ہے وہ عین اپنی ہی خیر خواہی اور اپنی ہی آزادی اور آرام کی حفاظت ہے۔ اُس ملک کی رعایا کی نسبت انصاف سے یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ وہ ملکی انتظام کا داہنا ہاتھ ہے۔ اور جہاں یہ بات نہیں ہے اور

رعایا کو وہ لیاقت حاصل نہیں۔ وہاں جس قدر ترجیح گورنمنٹ کو دیجائے وہ سب بجا اور حق بجانب ہے چنانچہ ہندوستان کا حال بھی آجکل ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اور یہاں لوگوں کی طبیعتیں اس قدر پست اور ہمتیں اس قدر سُست ہو رہی ہیں۔ کہ خود اپنی بھلائی کے کاموں میں نہایت کم شریک ہوتے ہیں۔ اور ہر قسم کے کام کا دارومدار بالکل گورنمنٹ پر ہے تعلیم کا سا نازک معاملہ اور اہم مقدمہ لوگوں نے بالکل گورنمنٹ پر منحصر کر رکھا ہے۔ لکھنا سکھلاوے تو گورنمنٹ سکھاوے پڑھنا سکھلاوے تو گورنمنٹ سکھلاوے۔ شفاخانے گورنمنٹ قائم کرے زراعت کی ترقی کے وسیلوں کو صرف یہی نہیں کہ گورنمنٹ موجود اور مہیا ہی کردے بلکہ یہ امید کی جاتی ہے کہ گورنمنٹ اپنے آدمیوں کی معرفت ہی ہل بھی چلوا دے تخم ریزی بھی وہی کرادے آبپاشی بھی وہی کرے غلّہ کو بھی گورنمنٹ ہی کاٹے وہی صاف کرے یہانتک کہ وہی پیسے اور پکاوے اور نوالہ بنا بنا کر منہ میں دیتی جاوے یہی حال علیٰ ہذا القیاس اور دستکاریوں اور ہنر و فنون کا ہو رہا ہے۔ اگر کسی کو یہ ولولہ ہوتا ہے کہ اس ملک کے باشندے بھی اور ملکوں کی سی دستکاریاں سیکھیں تو ساتھ ہی دل میں یہ خواہش اور گورنمنٹ کی طرف سے ذہن میں یہ شکایت پیدا ہوتی ہے۔ کہ گورنمنٹ ہماری تعلیم کے لئے ایسے مدرسے اور کارخانے کیوں قائم نہیں کرتی جن میں اس قسم کی تعلیم ہو۔ چھاپہ خانوں کی ترقی اور اُن کا استحکام اب اسی پر منحصر ہو گیا ہو کہ گورنمنٹ ہی کتابیں خریدکرے۔ اور گورنمنٹ ہی اخبار مول لے غرض کہ ہندوستان میں ہمہ اوست و ہمہ از وست کا مصداق لوگوں نے ٹھیک ٹھیک اور بلا تشبیہ گورنمنٹ کو قرار دے رکھا ہے اور گو ہم بشکر گذاری تمام تسلیم کرتے ہیں کہ گورنمنٹ نے جہاں تک ممکن ہوا ان کاموں کو مدد دی ہے اور حتی الامکان اپنے فرض کو ادا کیا ہے۔ لیکن پھر آخر کہاں تک گورنمنٹ کی آمدنی محدود ہے اس لئے وہ بمجبوری اُسی قدر ذمہ واری کر سکتی ہے۔ جہاں تک اُس سے ممکن ہے نہ اُس سے زیادہ ✤

اس بات کو بخوبی سمجھ لینے کے واسطے کیسی عمدہ ایک مثال حال ہی کے زمانہ کی موجود ہے۔ کہ ایک سال گورنمنٹ نے یہ سمجھکر کہ اہل ہند کا انگلستان میں جانا اور تعلیم پانا نہایت عمدہ بات ہے اور اہل ہند کے لئے جو خود اپنی فلاح کے کاموں سے بے خبر ہیں نہایت نافع ہے پچاس ہزار روپیہ سالانہ اس غرض سے منظور کیا کہ اس طرف سے نو آدمی ہر سال مختلف علاقہ ہائے ہندوستان سے انگلستان کو تعلیم کے لئے جاویں چنانچہ ایسا ہی ہوتا اور جو عمدہ نتیجہ اُس سے ظاہر ہوا وہ ظاہر ہے۔ اور کاش اگر چند برس بھی یہ قاعدہ اور جاری رہتا تو ہر ادنےٰ اور اعلےٰ اُس کے فائدوں کی قدر کو بخوبی پہچاننے لگتا لیکن گورنمنٹ اپنے مقدور سے زیادہ کام نہیں کر سکتی۔ آیندہ برس ہیں اس کی آمدنی نے اس خرچ کے لئے کفایت نہ کی۔ اور لاچار اس نے چندروز کے لئے یہ قاعدہ توڑ دیا ✤

علاوہ اس کے یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ گورنمنٹ نے ہر طرح رعایا کی بہبودی کے کاموں کے قائم کرنے میں کوشش کی لیکن چونکہ رعایا اس میں خاطر خواہ شریک نہیں ہوئی۔ اس لئے یہ کہنا کچھ نامناسب نہ ہوگا۔ کہ گورنمنٹ کو اُن کاموں میں جیسی چاہیئے تھی ویسی کامیابی حاصل نہیں ہوئی گورنمنٹ نے مدرسے بنائے شفاخانے قائم کئے۔ ٹیکہ کا محکمہ گورنمنٹ نے قائم کیا لیکن لوگوں کی کوشش اور رعایا کی مدد اُس کی طرف کافی نہ ہوئی علیٰ ہذا القیاس انہیں باتوں پر اور باتوں کو قیاس کر لینا چاہیے۔ شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کاموں کا کامل طور پر نافع نہ ہونا رعایا کی نافہمی اور تعصب اور جہالت وغیرہ کا سبب ہوا لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ جہالت اور تعصب بھی رعایا میں اسی واسطے پیدا ہوا۔ اور ترقی کو ٹکا گیا کہ ان کاموں کے شروع ہونے میں رعایا کی شرکت اور مشورت نہ تھی۔ اور کچھ شبہ نہیں ہے۔ کہ اگر رعایا ان سب کاموں میں شریک و مشورہ کار ہوتی یا خود اُن کاموں کو شروع کرتی۔ اور اُس کا ولولہ بھی ان کاموں کی طرف لگا رہتا تو یہ تعصب وغیرہ جواب پیدا ہوا ہرگز نہ پیدا ہوتا۔ پس غور کرنا چاہیئے کہ ایک کام جو نہایت عمدہ سمجھ کر گورنمنٹ نے بلا شرکت رعایا کے شروع کیا اس میں صرف یہی ناکامی نہ ہوئی کہ زر کثیر صرف ہوگیا۔ اور بڑی بڑی کوششیں بیکار ہوگئیں۔ بلکہ اہل ہند کی تربیت کا زمانہ وراہاتھ سے جاتا رہا۔ ان تمام واقعات سے ایک بہت اچھی نصیحت ہمارے واسطے یہ پیدا ہوتی ہے۔ کہ جو کام ہم کو اوروں کی بھلائی کے واسطے شروع کرنا ہو۔ ضرور اُس میں ان لوگوں کو بھی جس طرح ہو سکے شریک کر لینا چاہیئے جن کے نفع کے واسطے وہ کام شروع کیا جاوے ۔

اس مقام پر ہمارا یہ مقصد نہیں ہے۔ کہ ہم اس ناکامی کے الزام کو گورنمنٹ کی طرف منسوب کریں۔ بلکہ ہماری غرض اپنے اہل وطن سے یہ ہے کہ اگر وہ خود اپنی فلاح کے کاموں میں توجہ نہ کریں گے اور سارا دارومدار اپنا گورنمنٹ ہی پر رکھینگے۔ اور گو گورنمنٹ نہایت نیک نیتی سے حتی الامکان اُن کی بھلائی میں کوشش بھی کرے لیکن اُن کی پوری بھلائی اس کے ذریعہ سے ناممکن ہوگی ۔

جب ہم یہ بات اوپر ثابت کر چکے کہ ہر گورنمنٹ اسی قدر توجہ کی متحمل ہو سکتی ہے۔ جس قدر بوجھ اٹھانے کی اس میں طاقت ہے تو یہ بات بھی ضرور ہے کہ جب نئے نئے بوجھ جس میں بہت سا حصہ خود رعایا کو اپنے اوپر اٹھانا چاہیئے تھا صرف گورنمنٹ پر ڈالے جاوینگے۔ تو بلاشبہ گورنمنٹ کو بھی اُسی قدر اپنی طاقت بڑھانے کی فکر ہوگی۔ مثلاً اگر اپنی تعلیم کا بندوبست ہندوستان کی رعایا خود آپ کر لیتی۔ تو گورنمنٹ ہرگز اُن سے تعلیم کا چندہ طلب نہ کرتی۔ گورنمنٹ کوئی سونے کی کان نہیں ہے۔ کہ جتنا سونا اس میں سے چاہو کھود لو۔ اور اُس میں کمی ہی واقع نہ ہو۔ وہاں تو گئی ہوئی پوٹیاں اور نیا شور رہا ہے

روز کا کنواں کھودنا اور روز کا پانی پینا ایک سال کی آمدنی دوسرے سال کے لئے بھی پس انداز نہیں ہوتی بلکہ جس قدر آمدنی میں کمی رہ جاتی ہے وہ کسی نہ کسی سبیل سے رعایا ہی سے وصول کی جاتی ہے اور انہیں تلوں میں سے تیل نکالا جاتا ہے۔ ایک نہایت مدبر کا قول ہے۔ کہ اگر شاہی خزانہ پر کچھ خرچ ڈالنا چاہتے ہو تو پہلے تم اُس روپیہ کو خزانہ میں رکھ لو۔ پس ان حالات کے لحاظ سے بھی یہ کون نیکی کی بات ہے کہ جو کام خود ہمارے کرنیکے ہیں اُن کو ہم خود نہ کریں اور گورنمنٹ سے اُس کے انجام دینے کی نسبت درخواست کریں روپیہ کا روپیہ اپنا ہی صرف ہو اور تربیت یافتہ قوموں کے نزدیک نالائق کے نالائق ٹھیریں یکے نقصان مایہ و دیگرے شماتت ہمسایہ اور قطع نظر اس کے جب کوئی ایسا کام گورنمنٹ کی معرفت انجام ہوگا۔ جو ہم کو خود کرنا تھا۔ تو ضرور ہمارے اختیارات اس میں کم ہو جاوینگے۔ اور اس وقت ہم کو اور ایک قسم کی مشکل پیدا ہوگی غرض جس پہلو پر دیکھئے ہمیشہ ہم کو اپنے کرنیکے کام اوروں پر ٹال دینے سے سوائے ناکامی اور رنج اور رسوائی کے کوئی اور نتیجہ پیدا نہ ہوگا۔ اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ جس کام کو خود ہم کر سکتے ہیں اور خود ہم کو کرنا چاہئے۔ اُس کو دوسروں پر ٹالتے رہنے سے ہماری ہمتیں بھی پست اور سُست ہوتی جاتی ہیں۔ اور مہذب قوموں کے نزدیک ہم اپنے ایسے ہی ایسے افعال سے دن بدن ذلیل ہوتے جاتے ہیں ❊

دیکھو جب ہم بازاروں میں یا عام گذرگاہوں اور سڑکوں پر گذرتے ہیں اور موٹے مسٹنڈے فقیر ہم کو پیٹتے ہیں۔ تو ہم کو اُن کو یہ نالائق حرکت کیسی بُری معلوم ہوتی ہے۔ اور ہم اُن کو کس حقارت سے دیکھتے ہیں یہی حال ہماری گورنمنٹ اور اُس کے مہذب عہدہ داروں اور تربیت یافتہ قوموں کے نزدیک ہمارا سمجھنا چاہئیے کہ باوجود خود ہر قسم کی مقدرت رکھنے کے پھر ہر کام کا مدار گورنمنٹ ہی پر رکھتے ہیں ❊

بلاشبہ ہندوستان میں روز بروز اب لوگوں میں آپس کے اتفاق سے کام کرنیکا ولولہ پیدا ہوتا جاتا ہے اور اس آخر قرن میں جو موجودہ زمانہ پر منتہی ہوتا ہے بہ نسبت اس صدی کے اور پچھلے قرنوں کے اس ولولہ کو بہت ترقی ہوئی ہے جابجا سوسئٹیاں اور انجمنیں قائم ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بہتیرے کام جس ولولہ سے شروع ہوتے ہیں۔ اُس ولولہ کے ساتھ اکثر غلطیوں میں مبتلا ہو جانے کے سبب سے انجام کو نہیں پہنچتے اور وہ غلطیاں اگرچہ اُن میں ایک یا دو قسم کی ہوتی ہیں۔ لیکن اُن کے سبب سے رفتہ رفتہ اور دن بدن بہت سی غلطیاں پیدا ہو جاتی ہیں ❊

وہ غلطی جو اکثر ان کاموں میں اوّل ہی اوّل واقع ہوتی ہے یہ ہے کہ جو لوگ اس کام میں شریک

ہوتے ہیں۔ وہ اس کام کے بانیوں کی رعایت و مروّت یا دنیا کی شرم و حیا سے شریک ہو جاتے ہیں اپنے خاص شوق سے شریک نہیں ہوتے اور اسی لئے چند عرصہ کے بعد لوگوں کو اُس کام میں مدد کرنا وبال جان معلوم ہونے لگتا ہے روپیہ کے وصول میں دقّت پیش آتی ہے لوگ توجہ کم کرنے لگتے ہیں کام سُست ہو جاتا ہے اور اس کام کے بانیوں کی ہمتیں بہ مجبوری پست ہو جاتی ہیں لیکن بجائے اس کے کہ استقلال کے ساتھ کوئی اور تدبیر معقول اُس کے استحکام کی عمل میں لائی جاوے ایک اور غلطی اُس کے سبب سے پیدا ہو جاتی ہے جس کے سبب سے اس نوبت کارروائی میں اس کام کے بانیوں کی طبیعت گورنمنٹ کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور جس غیرت اور حمیت کے ساتھ وہ کام بلا استعانت گورنمنٹ شروع کیا گیا تھا۔ وہ سب بالائے طاق دھرے رہ جاتی ہے اور تیسرے فاقہ پر مردار بھی حلال سمجھکر بہ مجبوری گورنمنٹ کے آگے بے تکلف ہاتھ پھیلانے پڑتے ہیں۔ اگر گورنمنٹ نے اپنی معمولی رحمدلی سے اس وقت میں دو قطرہ آب سے اُس نیم بسمل کام کی کچھ مدد کی تو کوئی دن کی زندگی اور نکل آئی ورنہ انا للہ و انا الیہ راجعون فاتحہ خیر پڑھکر اُس کے بانیوں نے بھی اس کام سے ہاتھ کھینچا لیکن جو جان تازہ اُس وقت میں گورنمنٹ سے کسی کام کو عنایت ہوتی ایک وہ دائم المریض آدمی کی مانند محض بے حلاوت ہوتی ہے نہ اُس طرف لوگوں کی امنگ اور نہ اس میں کچھ ترقی کی امید ہوتی ہے ٭

لندن میں عید الفطر کی نماز

اب کی مرتبہ لندن میں بھی عید الفطر کی نماز ہوئی۔ امام و مقتدی سب دس آدمی تھے حافظ احمد حسن صاحب سفیر جناب نواب صاحب بہادر سابق والی ٹونک نے نماز پڑھائی مقتدیوں میں سید محمود صاحب مولوی سید احمد خان صاحب بہادر کے صاحبزادہ اور مرزا خداداد بیگ صاحب جو تحصیل علم کے واسطے لندن میں وارد ہیں اور اَور لوگ شامل تھے۔ پس یہ ایک ایسی خبر ہے جس سے مسلمانوں کو نہایت خوش ہونا چاہیئے ٭

جو خام اعتقاد مسلمان لندن جانے ہی کو خلاف شان اسلام سمجھتے ہیں وہ اب خیال فرمالیں کہ مذہب اسلام نہ کعبہ جانے پر موقوف ہے اور نہ لندن جانے پر نیت صحیح اور ادائے استواء ہر مقام پر شرط ہے اب یہ وقت ہے کہ ہندوستان کے رؤسا مسلمان ان تعصبات کو جو بعض غلط فہمیوں کے سبب سے اُن میں چلے آتے ہیں چھوڑ دیں۔ اور اپنی اولاد کو اعلے درجہ کی تعلیم حاصل کرنے کے واسطے بے تکلف انگلستان کو بھیجیں جیسا ترکی اور مصر کے مسلمان کر رہے ہیں۔ الطلب العلم

ولو کان بصاین ٭

شیریں زبانی

شیریں زبانی بھی انسان کے واسطے ایک نہایت عمدہ صفت ہے۔ اور تہذیب انسانی کا ایک بڑا رکن ہے یہ وہ جوہر ہے جس کے ذریعہ سے انسان بغیر استعانت زور اور زر کے دوسرے انسانوں کی طبیعت پر غالب آسکتا ہے اور اپنے خیالات کو دوسروں کے ذہن میں بٹھلا سکتا ہے فصاحت اور بلاغت بلکہ ہر قسم کے صنائع اور بدائع جو انسان کے کلام کے بڑے بڑے رکن ہیں اور جن کے سبب سے آدمی بڑا قابل اور بڑا فصیح اور ادیب یا ایک بہت بڑا شاعر مشہور ہو سکتا ہے۔ ان سب کمالات کا صلہ اکثر اوقات صرف زبانی مدح و ثنا سے کافی طور پر ادا ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ کلام جس سے انسان کسی قدر کچھ کام نکال سکتا ہے اور دوسروں کو اُس کے ذریعہ سے اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے وہ درحقیقت اُس قسم کا کلام ہوتا ہے جس میں شیرینی ہو۔ میٹھا بولنا دشمنوں کو بھی دوست بنا لیتا ہے۔ اور برخلاف اس کے تلخی سے اپنے بھی بیگانے ہو جاتے ہیں اور بہت سے کئے کرائے کام ملیا میٹ اور گئے گذرے ہو جاتے ہیں ٭

زبان شیریں انسان کی وہ ذاتی صفت ہے جو اس کو ہر موقع پر ہر درجہ کے لوگوں کے ساتھ چھوٹا ہو یا بڑا اعلیٰ ہو یا ادنےٰ ہمقوم ہو یا غیر قوم ہم مذہب ہو یا غیر مذہب۔ دوست ہو یا دشمن امیر ہو یا فقیر سب سے یکساں برتنی چاہئے۔ عمدہ ترین انسانوں میں وہ انسان ہے کہ جو لوگ اس کو بُرا کہیں اُن سے بھی وہ نہایت نرمی اور ملائمت سے کلام کرے اور دوسروں کی جہالت اور ناشائستگی کے مقابلہ پر اپنی تہذیب کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے حلیم الطبع آدمی بعض اوقات اس انسانی حد سے آگے کو قدم بڑھا جاتے ہیں چنانچہ ہمارے بعض مسلمان بھائیوں نے کسی غیر مذاہب والے یا کسی خاص فرقہ کے مقابلہ پر جو کتابیں تحریر فرمائیں اُن میں بھی ان صاحبوں نے اس عمدہ صفت کو اکثر فروگذاشت کیا ہے یہ سچ ہے کہ بعض اوقات کسی غیرت یا غصہ یا جوش میں آدمی کو اس بات کا خیال نہیں رہتا لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ کسی قدر بلکہ اکثر اُس کا یہ بھی سبب ہوا ہے کہ ان بزرگواروں نے کسی فضول اور غیر مہذب شخص کے مقابلہ پر ویسی ہی فضولی سے پیش آنے کو معیوب خیال نہیں کیا ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ عارضی غصہ یا جوش کتابوں کی صورت پکڑ کر ایک قوم کے اخلاق کا جزو ہو جاتا ٭

عمدہ غرض اور اعلےٰ مقصد ان تصنیفات کا یہ ہونا چاہیئے تھا کہ جن کے سمجھانے اور قائل کرنے کی نیکی غرض سے وہ کتابیں تحریر ہوئی تھیں وہ اُن کو انصاف کی نظروں سے دیکھتے مگر یہ جب ہی ہوتا ہے

جب وہ کتابیں نامناسب الفاظ سے پاک صاف ہوتیں اور طرز بیان اُن کا نہایت شیرینی اور لطافت کیساتھ ہوتا حالانکہ اب اُن کتابوں سے سوائے اسکے اور کوئی فائدہ بظاہر مترتب نہیں ہوسکتا کہ خود وہ مصنف یا انکے اور چند ہم مذہب آپس ہی میں اُن تصنیفات کو دیکھکر خوش ہوں اور باہم ایک دوسرے کو واہ واہ اور مرحبا کہہ لیں پس کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ان معزز بھائی مسلمان مصنفوں نے اپنی نہایت عمدہ محنتوں اور تحقیقاتوں کو تلخی اور سختی کلام سے صرف داغ ہی نہیں لگایا بلکہ ان محنتوں کو بالکل بیکار کر دیا اور اس سے بھی بڑھکر جو نقصان مسلمانوں کو اُن تصنیفات سے ہوا وہ یہ ہے۔ کہ ہمارا اخلاق بھی غیر قوموں کے نزدیک ایسا ہی معیوب سمجھا گیا۔ جیسا ہمارے نزدیک اُن نامہذب لوگوں کا اخلاق تھا جن کے جواب میں بلکہ درحقیقت اُن کے جلانے کے واسطے ہم نے یہ کتابیں لکھیں +

بہلا ان اہل تصنیفات سے جو یہ غلطی ہوئی اس کو ناسمجھی سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان تصنیفات کا حال جواب ترکی بہ ترکی ہے حالانکہ ہم کبھی اس جواب کو تسلیم نہ کرینگے لیکن ہم دیکھتے ہیں۔ کہ بعض وہ باہمت مسلمان جو اس بات کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔ کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کی اصلاح میں جہاں تک ممکن ہوگا کوشش کریں گے۔ اور اس لئے اُن پر فرض ہے کہ جو حرف اُن کے منہ سے نکلے اور جو لفظ اُن کے قلم سے لکھا جاوے اس کے ہر ایک پہلو پر خوب غور کر لیں۔ کہ اُس سے کوئی ناحق کی نارضامندی تو مسلمانوں کو نہ ہوگی۔ اُن صاحبوں کا بعض اوقات یہ حال ہوتا ہے کہ وہ بھی جادہ اعتدال سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ اور فرط محبت اور جوش ہوا خواہی میں آکر بعض دفعہ ایسے نامناسب لفظ اُن کی زبان اور قلم سے سرزد ہوجاتے ہیں۔ جن پر عام لوگ پے نہیں لے جاسکتے اور اُن عوام کے سامنے خواص کا ناویلیں کرتے کرتے ناک میں دم آجاتا ہے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں۔ کہ ناصح جتنا دلسوز ہوگا۔ اُسی قدر اُس کی نصیحت کے فقرے تلخ ہونگے لیکن ایک دانا ناصح یقیناً اپنے جوشوں کو ضبط ہی کریگا۔ اور بلاشبہ وہ جس مطلب کو اچھے اچھے لفظوں میں بیان کر سکتا ہے۔ اُن کو بُرے لفظوں میں بیان نہ کرے گا +

ہم مسلمانوں کے اعتقاد کے بموجب ابتدائے آفرینش سے آج تک اس دنیا میں کوئی ایسا دانا اور دلسوز ناصح پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ آیندہ ہونے کی امید ہے جیسے ہمارے رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم ہوئے پھر دیکھو کہ اُس خدا نے جو بڑی حکمتوں والا اور تمام مخلوق کے قلوب پر حاوی اور متصرف ہے اپنے رسول سے اس معاملہ میں جس پر ہم یہ گفتگو کر رہے ہیں۔ کیا ارشاد فرمایا ہے +

[1] قال تبارک و تعالیٰ ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن ÷ یعنی جن لوگوں کی اصلاح مدنظر ہے۔ اگر فی الواقع اُن میں کوئی الزام کی بات ہے تو اس کے بیان کرنے کا مضائقہ نہیں لیکن طرز بیان ایسا ہونا چاہیئے کہ اس سے لوگوں کو آزردگی نہ ہو۔ چنانچہ کچھ شبہ نہیں کہ جناب رسُول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد کی تعمیل نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے کی۔ تمام حدیث کی کتابیں اس کی شاہد حال ہیں۔ کہ جو مطالب اُن میں بیان کئے گئے ہیں کیسے معتدل اور ملائم اور شیریں لفظوں میں بیان ہوئے۔ اور گو یہ صحیح ہے کہ جن لوگوں کی قسمت میں ہدایت نہ تھی۔ ان کو ہدایت نصیب نہ ہوئی۔ لیکن یہ الزام شاید رسُول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی نے نہیں لگایا کہ معاذ اللہ وہ مغلوب الغضب تھے یا اپنے جوش میں آکر ایسے سخت لفظ کہہ جاتے تھے کہ سامعین کو ناگوار خاطر ہوتے تھے۔ اور اس لئے وہ لوگ اُن کے ذریعہ سے ہدائیت پانے سے باز رہے پس ہمارے مسلمان بھائیوں کو مناسب ہے کہ جو نہایت سچا اور عُمدہ راستہ اُن کے نبی نے خود اختیار کیا اور اَوروں کو بھی اسی پہ چلنے کی نصیحت کی اسی راستہ پر قائم رہیں ÷

اس بات پر بھی اچھی طرح غور کرنا چاہیئے کہ خدا نے یہ مذکورہ بالا نصیحت اپنے ایسے نبی کو فرمائی تھی۔ جن کو شر شیطان سے ہر طرح محفوظ رکھا تھا۔ واسطے بہرحال ہم گنہگاروں کے کہ کیسی بُری طرح سے اُس کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں یہ اُسی شیطان کا فریب ہے کہ ہم کو کسی غیر مذہب یا ہم مذہب کے کسی نامہذب شخص کے مقابلہ میں لاکر ہم سے بھی ویسی حرکتیں کرانے لگتا ہے۔ جیسی اُس غیر مہذب شخص میں تھیں اور پھر اس کا نام ہمارے خوش کرنے کی غرض سے کبھی جواب ترکی بہ ترکی ٹھیراتا ہے کبھی اس کو جواب دندان شکن کے نام سے تعبیر کراتا ہے کبھی ہم کو ہماری ان بیجا حرکتوں پر ثواب کا امیدوار کرتا ہے اور کبھی ان غیر معتدل بلکہ نامناسب الفاظ کو جو ہم سے تقریر یا تحریر میں نافہمی کی راہ سے سرزد ہوتے ہیں اپنی قوم کی فرط محبت سے منسوب کرتا ہے اور پھر خود ہی وہ آفت روزگار دوسروں کے دلوں میں ان الفاظ اور فقرات کے سبب سے ایک رنج پیدا کر دیتا ہے اور اس حیلہ و نیرنگ سے باہم عداوت کرا دیتا ہے بڑے بڑے اتفاقوں اور محبتوں کو طرفۃ العین میں درہم برہم کر دیتا ہے۔ اور بڑے بڑے عالی ارادوں کو جو عام کے فائدہ کے واسطے کئے جاتے ہیں۔ بالکل پریشان کر دیتا ہے ÷

---

[1] اے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) بلا لوگوں کو اپنے رب کی راہ پر پکی باتیں سمجھا کر اور اچھی طرح نصیحت کر کر اور الزام دیگران کو جس طرح بہتر ہو۔ رکوع اخیر پارہ ۱۴ ÷

علم اخلاق میں یہ بات عقلاً اور نقلاً ہر طرح سے ثابت ہو چکی ہے کہ تعلیم اور فہمائش ہمیشہ نرم لفظوں میں چاہئے اور اس کے برخلاف کبھی وہ کارگر نہ ہوگی اور تمام عقلا، روزگار اور انبیاء علیہم السلام کا عملدرآمد اسی پر رہا لیکن اکثر اوقات انسان اپنے جوش یا غصہ سے مجبور ہو جاتا ہے اور زور تحریر یا زور تقریر تمام مصلحت پر غالب آجاتا ہے چنانچہ ان شیطانی وسوسوں اور آفتوں سے محفوظ رہنے کے واسطے خدا تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں نبی کی معرفت ہم کو یہ ارشاد فرمایا ہے ؛

[1] قل لعبادی یقولوا التی ہی احسن ان الشیطان ینزغ بینہم ان الشیطان کان للانسان عدوا مبینا ربکم اعلم بکم ان یشا یرحمکم او ان یشا یعذبکم ؛

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کے ذہن میں یہ بات جم جاتی ہے کہ میں نے جو کچھ سمجھا ہے سب سچ سمجھا ہے اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اور کر رہا ہوں وہی بالکل سچ ہے اور اس لئے وہ اور آدمیوں کو جو اس کی رائے سے ناواقف یا برخلاف ہوتے ہیں خواہ مخواہ حقارت سے دیکھنے لگتا ہے اور اسی حقارت کی نظر سے کوئی کوئی سخت اور نامناسب لفظ بھی ان لوگوں کی نسبت اس کی زبان یا قلم سے نکل جاتا ہے اور یہ عملدرآمد بالآخر باہمی نزاع اور برہمی کا سبب ہو جاتا ہے پس خدا تعالیٰ نے اپنے اس کلام پاک میں اس قسم کے خیالات کی بھی روک تھام فرمائی اور ارشاد کیا کہ ان باتوں کو تمہارا پروردگار ہی خوب جانتا ہے جس کا علم ہر طرح پر کامل ہے تم اپنے خیالات کے لحاظ سے ایک دوسرے کی نسبت ایسے نامناسب الفاظ نہ کہو جو باہمی رنجش کا سبب ہو جاویں اور شیطان کو جو ہمیشہ اسی فکر میں رہتا ہے اپنا موقع ہاتھ آوے اعمال کی بھلائی اور برائی پر جزا اور سزا دینا یہ خدا ہی کا کام ہے چنانچہ اور ایک مقام پر بھی خدا تعالیٰ نے اس کی تصریح فرمائی ہے ؛

[2] قل کل یعمل علیٰ شاکلتہ ؛ فربکم اعلم بمن ہو اہدیٰ سبیلا ؛

پس میری غرض اور میرا التماس عموماً اپنے تمام مسلمان بھائیوں سے اور خصوصاً ان اہل ہمت سے جو علم کلام کے لوگ ہیں اور جو اپنی قوم کو اپنی عمدہ نصیحتوں سے مہذب بنانا چاہتے ہیں یہ ہے کہ اپنے کلام دوست سے ہو یا دشمن سے اعلیٰ سے ہو یا ادنیٰ سے نہایت شیرینی اور لطافت اور نرمی سے استعمال

---

[1] یعنی اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دے میرے بندوں کو کہ بات وہی کہیں جو بہتر ہو۔ بیشک شیطان جھگڑا کرا دیتا ہے آپس میں بیشک شیطان انسان کا دشمن صریح ہے تمہارا رب بہتر جانتا ہے تم کو اگر چاہے تم پر رحم کرے اور اگر چاہے تم پر عذاب کرے (پارہ ۱۵ رکوع ۵)

[2] کہہ دے اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہر کوئی اپنی وضع پر عمل کرتا ہے سو یہ بات کہ کس نے اچھی راہ اختیار کی۔ تیرا رب ہی خوب جانتا ہے (پارہ ۱۵ ۔ رکوع ۸) ؛

میں لاویں اور سخت اور درشت الفاظ سے جس قدر ہو سکے کنارہ کریں اور جو قانون کارخانہ قدرت کے بنانے والے نے ہمارے لئے مقرر کر دیا اس کو اپنے کسی جوش و خروش کا تابع نہ کریں اور جو عمدہ اور نہایت عمدہ مذہب اُن کو خوش قسمتی سے نصیب ہوا ہے اُس پر بہت سچائی اور نیک نیتی سے قائم رہیں۔ کہ یہی سچی شائستگی ہے اور یہی سچی تہذیب ہے۔ اور دونوں جہان کی ہر قسم کی خوبیاں سب اِس میں موجود ہیں +

تقویٰ

وَخَيْرَ الزَّادِ التَّقْوىٰ

ہمارے اخبار یکم ذیحجہ میں ایک مختصر فہرست اُن مراتب کی چھپی تھی جن میں مسلمانوں کو تہذیب کرنا چاہئے۔ لیکن میری دانست میں اُس میں ایک بڑا امر فروگذاشت ہوا یعنی تقویٰ جو مسلمانوں کی موروثی ملک ہے۔ اور اب ہندوستان کے مسلمانوں میں پہلے زمانہ کی یہ نسبت اُس کی نہایت کمی ہے اس زمانہ میں اکثر تقویٰ اتنی بات پر ختم ہوتا ہے کہ پیجامہ ٹخنوں سے نیچا نہ رہے اور ناچ رنگ وغیرہ کی مجلس میں شریک نہ ہوں (خیر خدا اس کو بھی اور قائم رکھے) +

کسب حلال جس کی نسبت یہ کہنا بجا ہے کہ وہ ایک زمانہ میں مسلمانوں کا خمیر تھا۔ اب اُس کی طرف سے ایسی غفلت برتی جاتی ہے کہ خدا محفوظ رکھے سود سی شے جسکے لینے والوں کی نسبت خدا یوں ارشاد فرمائے کہ "فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ" یعنی اُٹھ کھڑے ہو خدا اور اُس کے رسول سے لڑنے کے واسطے اب وہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ہماری شامت اعمال سے ایسا عام ہو گیا کہ کھاتے پیتے مسلمان شاید فیصدی دس بھی اس بلائے عالمگیر سے محفوظ نہ ہونگے۔ اور روپیہ سینکڑہ کے سود سے نالش عدالت میں کرنا یہ تو اب کچھ عیب ہی نہیں رہا۔ دو وقت کی نماز قضا ہونیکا کبھی اتنا ملال نہ ہو جتنا ایک سود کی نالش ڈسمس ہونے کا۔ بڑے بڑے موٹے موٹے حافظ اور بڑی بڑی نیچی ڈاڑھیوں والے مولوی جو وہابیت میں بھی ماشاء اللہ دم بھرتے ہیں اس لقمہ حرام کی چاٹ اور مال و دولت کی طمع خام میں مبتلا ہیں +

رونا تو اس بات پر آتا ہے کہ اپنی ان حرکات کے سبب سے کبھی ماتھے پر پسینہ نہ آوے۔ مگر جب کسی مسلمان کو کسی اہل کتاب کے ساتھ ہم طعام دیکھیں تو حمیت اسلامی جوش میں آجاوے۔ اور بغیر نعوذ باللہ

اور توبہ توبہ کے اُس مسلمان کمبخت کا نام نہ لیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار +

معاش کے اور ذریعوں کا بھی یہی حال ہو رہا ہے۔ نوکروں میں چوری اور رشوت زمینداروں میں زیادہ ستانی و شوق سیاست، سوداگروں میں دغابازی اور حرفت دن بدن ترقی پر ہیں وعلیٰ ہذا القیاس لیکن میرے نزدیک جب تک مسلمانوں میں سے یہ خرابیاں رفع نہ ہونگی تب تک کبھی اُن کی قوم کو سچی ترقی اور عزت نصیب نہ ہوگی کیسے ہی پھولوں اور پھولدار درختوں سے اپنے گھروں کو رشک گلزار ارم کیوں نہ بنادیں اور جاکٹ پتلون کیوں نہ پہنیں اور میز و کرسی پر چھری کانٹے سے طلائی نقرئی نہایت شفاف اور جلادار برتنوں میں کیوں نہ کھاویں اور کیسا ہی اپنے طریق زندگی کو آجکل کی مہذب اور روشنضمیر قوموں کی مانند اعلےٰ اور عمدہ کیوں نہ بنادیں پس مسلمانوں کو چاہئے کہ اول اپنا تقوےٰ درست کریں اس کے بعد قومی ترقی کا نام لیں۔ ورنہ ٹھیک اس آیت کے مصداق ہوں گے "قل هل ننبئكم بالاخسرين اعمالا الذين ضل سعيهم فى الحيوة الدنيا وهم يحسبون انهم يحسنون صنعاً" +

سید محمد محمود صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ

سید محمد محمود صاحب مولوی سید احمد خان صاحب بہادر سی ایس آئی کے چھوٹے صاحبزادہ کا سالانہ امتحان کرسیٹ کالج یونی ورسٹی لندن میں بڑی کامیابی کے ساتھ ہوا عام امتحان میں جو تمام علوم میں تھا اُن کا نمبر دسواں رہا۔ اور خاص انگریزی زبانی دانی میں تمام کالج میں صرف ایک اَور طالب علم اس قابل نکلا کہ اس کے جواب اور سید محمد محمود صاحب کے جواب برابر وقعت کے تھے۔ اس لئے دونوں کا نام اوّل نمبر میں لکھا گیا باقی تمام طالب علموں سے سید محمد محمود خاص اُن کی مُلکی زبان میں فائق ہے

عجبا بریں مژدہ گر جان فشانم رواست

یہ ایک ایسی مبارک خبر ہے کہ اس کے سبب سے نہ فقط مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر کو اور نہ صرف سید محمد محمود صاحب کے دوستوں ہی کو خوشی ہے بلکہ درحقیقت یہ ایک ایسی مبارک خبر ہے جس کے لحاظ سے تمام اہل ہند کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً خوش ہونا چاہیئے جو عزت اور فخر سید محمد محمود صاحب کو اس موقع پر حاصل ہوا شاید اس سے پہلے کسی اہل ہند کو نصیب نہیں ہوا تھا یہ نام آوری اس نام آوری سے کچھ کم نہیں ہے جو فیضی اور ابوالفضل نے ایرانیوں کے نزدیک ان کی خاص زبان فارسی کی قابلیت کے لحاظ سے حاصل کی تھی یہ ایک کافی وجہ ثبوت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کی طبیعتوں میں

ابھی تک وہ مادہ باقی ہے جس کے سبب سے انہوں نے پہلے بہت کچھ شہرت اور نیکنامیاں حاصل کی ہیں۔ اور جس کے لحاظ سے غیر قومیں اُن کا نام مدت تک بہت تعظیم اور ادب سے لیتی رہیں +

ہندوستان کے مسلمان بلاشبہ اپنی بدقسمتی سے نئے علوم وفنون کے حاصل کرنے میں اپنے اور اہل وطن سے کچھ پیچھے رہ گئے ہیں۔ جس کا نتیجہ اب تک بھی بہت ہی مضر ہوا ہے۔ اور اگر یہی غفلت خدانخواستہ چندروز اور رہی تو جس قدر مادہ مسلمانوں کی طبیعت میں ابھی تک موجود ہے اور جو شوق اور محنت سے بہت کچھ ترقی پاسکتا ہے وہ بالکل ملیا میٹ ہوجاویگا۔ جن بادشاہوں کی لیاقت اور اولوالعزمی کی یادگاریں بڑے بڑے قلعے اور عمارتیں روئے زمین پر موجود ہیں۔ اُن کی اولاد اب اسی قسم کی غفلتوں سے گھانس کھود کھود کر اپنا گذارہ کرتی ہے اُنکے برتاؤ اُنکے رنگ اور روغن اُن کی بول چال سے ہرگز یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ لوگ کسی ایسے بڑے خاندان کی بقایا ہیں مسلمانوں کو چاہیئے کہ عبرت پکڑیں اور جو عمدہ موقع اُن کے واسطے خدا کی عنایت سے اب موجود ہے اُس کا شکر کریں اور اُس کا شکر یہی ہے کہ اُس سے فائدہ اٹھاویں اور اپنی اولاد کی طرف ہوشیاری سے متوجہ ہوں +

مسلمانوں کے علم کی ترقی ابتدا میں یونانیوں کے علوم سے شمار ہوتی ہے۔ اور اب یورپ کی قوموں کے علوم ایسے کامل اور صاف طریقہ سے شائع ہوئے ہیں۔ کہ اگر مسلمان غور اور دانائی کو کام میں لاویں تو یونانیوں کے علوم کی بہ نسبت یوروپ کے موجودہ علوم وفنون سے بہت زیادہ فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔ جن قوموں سے ہم کو علم حاصل کرنیکی ضرورت ہے وہ ہماری خوش قسمتی سے خود ہم کو علم دینے کے واسطے آمادہ ہیں۔ کتابوں کی افراط چھاپہ خانوں سے درجہ کمال کو پہنچ چکی ہے اور پہنچتی جاتی ہے سفر کا ذریعہ ریل اور جہاز نے بہت ہی سہل کر دیا ہے۔ کوئی روک ٹوک سوائے اپنی کم ہمتی اور بیجا تعصبات کے باقی نہیں ہے۔ پس ایسے وقت میں نہایت ضرور ہے کہ ہندوستان کے مسلمان رئیس اپنی اولاد کو اعلےٰ تعلیم کے واسطے انگلستان کو بھیجیں +

ایک بڑا قوی مانع ہندوستان کے مسلمانوں کو اس ارادہ میں مذہبی نقصان کا خیال ہے اور بلاشبہ ہر عاقل مسلمان پر یہ فرض ہے کہ کسی ظاہری بڑی سے بڑی منفعت کے لحاظ سے اپنے مذہب کا تھوڑا سا نقصان بھی گوارا نہ کرے لیکن سید محمد محمود صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ کی کارروائی سے وہ شبہ بھی کامل طور سے جاتا رہتا ہے جہاں تک مجھ کو علم ہے میں نہایت اطمینان سے یہ بات بیان کرتا ہوں کہ سید محمد محمود کیمبرج کی یونیورسٹی میں تمام ممنوعات شرعی سے محترز ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں۔ اور روزے رکھتے رہیں۔ اور اچھے مسلمانوں کی مانند بہت خوشی الٰہی سے ...

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند *

میرے نزدیک جو عزت سید محمود صاحب کو اپنی علمی لیاقت کے سبب سے حاصل ہوئی اور آئندہ کامل طور سے حاصل ہونیوالی ہے۔ اُس سے بہت بڑی عزت اور افتخار اُن کو خدا کی عنایت سے ان کے عمدہ چال وچلن کے لحاظ سے حاصل ہوا ہے۔ اللّٰھم زد فزد *

اعتدال

انسان جس طرح تمام مخلوقات میں اشرف۔ اور سب سے زیادہ صناع اور عقلمند پیدا ہوا ہے اسی طرح تمام دنیا میں شاید اُس سے زیادہ کوئی اور مخلوق حاجتمند بھی نہیں ہے انسانیت اور خوشی اور ایمان کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے واسطے انسان کو اپنی اُس دشوار گذار منزل میں جو شکم مادر سے شروع ہوکر لب گور پر ختم ہوتی ہے بے انتہا غرضیں اور ضرورتیں متعلق ہوتی ہیں۔ اور وہ اکثر باہم ایسی مختلف ہوتی ہیں کہ اگر ایک مقصد کے حاصل کرنے میں حد معیّن سے زیادہ کوشش کی جاوے تو دوسرے مقصد کے فوت ہو جانیکا قوی اندیشہ ہوتا ہے پس اُس حد معیّن سے تجاوز نہ کرنے اور اس کو نگاہ رکھنے کا نام اعتدال ہے *

کوئی کام خواہ وہ تمدّن اور معاشرت سے علاقہ رکھتا ہو یا معاد اور آخرت سے ایسا نہیں پایا جاتا جس میں اعتدال کی ضرورت نہو تمام قوےٰ جو خدا نے انسان کو عطا فرمائے ہیں۔ اور جن کی بدولت انسان دونوں جہان میں ہر قسم کی خوشی اور آسایش اور آرام حاصل کر سکتا ہے وہ سب کے سب در حقیقت اعتدال ہی کی بدولت شگفتہ اور شاداب رہ سکتے ہیں پس قدرت کا یہ ایک ایسا سچا اور مستحکم اصول ہے کہ دنیا کا تمام کارخانہ اسی پر قائم ہے اور یہی حکمت تھی کہ مذہب اسلام میں اعتدال کی نسبت نہایت تاکید ہوئی اور کچھ شبہ نہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب میں مذہب اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی کوئی بات اعتدال سے خارج نہیں ہے۔ اس مذہب کا کوئی کام خواہ عبادت میں خواہ معاملات میں ایسا نہیں پایا جاتا جس میں اعتدال نہ ہو۔ فرائض جو خدا نے مسلمانوں کے واسطے مقرر کئے وہ سب معتدل ہیں۔ فرائض کے علاوہ اور تمام نیکیوں اور عبادتوں کا بھی یہی حال ہے۔ تمام عبادتیں اُسی وقت تک عبادتیں ہیں جب تک انسان کے قوےٰ معطل و بیکار نہ ہو جاویں اور اُس کے بعد رہبانیت ہے و لا رھبانیة فی الاسلام یہی حال مالی عبادت کا ہے خیرات و مبرات اُسی حد تک ٹھیک ہے جہاں تک انسان خود مفلس اور درماندہ اور نان شبینہ کو محتاج نہ ہو جاوے

راہ خدا میں گھر بار لٹا لنگوٹی باندھ کاسہ چوبی لے دھونی رما جنگل میں جا بیٹھنا مذہب اسلام کا منشا نہیں ہے کما قال اللہ تعالے عز وجل ولا تجعل یدک مغلولۃ الیٰ عنقک ولا تبسطہا کل البسط فتقعد ملوماً محسوراً [1]۔

یہی حال مسلمانوں کے دنیاوی برتاؤ کا ہے ہمارے معاملات دنیا کو بھی مذہب اسلام نے نہایت سہل کر دیا ہے تمام ستھری اور پاک چیزیں ہمارے واسطے حلال ہیں اور یہی نہیں کہ اُن کے استعمال کی فقط اجازت ہی دی ہو نہیں بلکہ اُن کے مطلق ترک کو بھی منع فرمایا تاکہ مسلمان حلال اور طیب چیزوں سے حظ اٹھانے میں محروم نہ رہیں یا ایہا الذین اٰمنوا لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین وکلوا مما رزقکم اللہ حلالاً طیباً واتقوا اللہ الذی انتم بہ مؤمنون [2]۔

یہی حال اور تمام باتوں کا ہے دنیا میں وہ تعلق جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے عموماً ہوتا ہے۔ اور جس سے انسان کے حظ زندگی کا بہت بڑا حصہ متعلق ہے وہ وہ تعلق ہے جو میاں اور بی بی میں ہوتا ہے۔ اس تعلق کے مستحکم اور خوشگوار کرنیکے واسطے جو احکام مذہب اسلام میں ہیں جب اُس کُل مجموعہ پر نظر کی جائے تو کوئی منصف آدمی بھی گو کسی مذہب کا کیوں نہ ہو مطلق اعتراض نہیں کر سکتا۔

میں اس مضمون میں اُن کمبخت اور ناخدا ترس مسلمانوں کی حمایت کرنا نہیں چاہتا ہوں جنہوں نے اپنا برتاؤ خلاف احکام خدا اور رسول کے قائم کر کے نہ فقط اپنی عاقبت خراب کی ہے بلکہ اپنی اُن ناشائستہ حرکات کی بدولت غیر مذہب والوں کی نظروں میں جو صرف ہمارے اعمال کی بھلائی برائی پر بظاہر مذہب اسلام کی بھلائی اور برائی کو قیاس کرتے ہیں مذہب اسلام کو حقیر کر دیا ہے میں اس وقت صرف اُن احکام سے بحث کرتا ہوں جو مذہب اسلام نے مسلمانوں کے برتاؤ کے واسطے نہایت اعتدال کے ساتھ مقرر کئے ہیں۔

کثرت ازدواج جس کی بدولت غیر مذہب والے مسلمانوں پر طعنہ کرتے ہیں جس طرح مسلمانوں کے مذہب میں جائز کیا گیا ہے ہرگز لائق اعتراض نہیں بلکہ بالکل قانون قدرت کے مطابق اور

---

[1] اور نہ رکھ اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا اور نہ کھول دے اس کو نرا کھولنا پھر تو بیٹھ رہے الزام کھایا ہارا (پارہ ۱۵۔ رکوع ۳)۔

[2] اے ایمان والو مت حرام ٹھہراؤ ستھری چیزیں جو اللہ نے تم کو حلال کیں اور حد سے مت بڑھو اللہ نہیں چاہتا زیادتی والوں کو اور کھاؤ اللہ کے دینے سے جو حلال ہو ستھرا اور ڈرتے رہو اللہ سے جس پر یقین رکھتے ہو (پارہ ۷۔ رکوع ۱)۔

نہایت ضروری ہے۔ اوّل تو مذہب اسلام نے یہ نہیں کیا کہ ایک نکاح کی قید کو توڑ کر زیادہ نکاح جائز
کر دیئے ہوں بلکہ ایک غیر محدود تعداد نکاح کو جو قبل اسلام کے رائج تھا بہت کچھ گھٹا کر محدود کر دیا
ہے۔ اور درحقیقت ایک سے زیادہ نکاح کی اجازت مذہب اسلام نے کسی مسلمان کو اُس وقت تک نہیں
دی جب تک شدید ضرورت نہ پائی جاوے فرض کرو کہ اگر ایسی بی بی سے اولاد نہ ہوتی ہو۔ اور عورت ہی
میں کوئی نقصان ہو تو مرد اگر اولاد کی خواہش میں جس سے کوئی دل خالی نہیں ہے دوسرا نکاح نہ کر سکے تو کس
قدر مایوسی کی بات ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اگر اولاد کی محرومی مرد کے کسی نقصان سے ہو تو عورت کو یہ اجازت
ہے کہ قاضی کے حضور میں مرد سے طلاق دلانے کے واسطے نالشی ہو۔ فرض کرو کہ کسی مرد کی خواہش اور قوت
ایسی بڑھی ہوئی ہو کہ اس کو دوسری بی بی کی حاجت ہو تو کیا گناہ ہے۔ اگر وہ دوسرا نکاح کرے۔ رہی یہ
بات کہ عورت کو ایسی اجازت کیوں نہ ہو اُس کا یہ حال ہے کہ اس معاملہ میں مرد ہی کو ترجیح دینا ضرور تھا
ایسی اجازت میں نطفہ کچھ متحقق نہ ہوتا میراث میں نہایت جھگڑا پڑتا قطع نظر اس کے مرد اور عورت کی
بناوٹ یہی بات چاہتی ہے کہ مرد کو ترجیح کا حق حاصل ہو عورت پر ہر مدت حمل میں اور بعد وضع
حمل ایک مدت ممتد ایسی گذرتی ہے کہ وہ مقید ہو جاتی ہے برخلاف مرد کے کہ وہ ہر وقت آزاد رہتا
ہے تمام دنیا میں اور ان ملکوں میں بھی جہاں عورتوں کے حقوق مردوں سے کچھ کم تسلیم نہیں ہوتے اب
تک روپیہ پیدا کرنے اور گھر کا انتظام قائم رکھنے اور کاروبار چلانے کا کام اکثر بلکہ عموماً مردوں
ہی سے متعلق ہے پس یہ تمام ترکیب اعضا اور لیاقتیں اور ذمہ داریاں جو مردوں میں ہیں بلاشبہ
اس لائق ہیں کہ ان کو عورتوں پر ترجیح حاصل ہو۔

باایں ہمہ اس ترجیح سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورتوں کے حق میں ناانصافی اور بے رحمی اور ظلم
جائز رکھا جاوے یہ تمام باتیں مذہب اسلام کے بالکل برخلاف ہیں۔ مسلمانوں کے مذہب میں فریقین کو نہایت
تاکید ہوئی ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ بہت پیار اور محبت سے رہیں۔ مردوں کو یہ نصیحت ہے کہ نفقہ
اور محبت اور باری میں غرض کہ جملہ باتوں میں اپنی سب بیبیوں میں مساوات اور عدل کو نگاہ رکھے۔
اور علےٰ قدر مراتب سب کی خاطر اور تواضع اور دلداری کرتا رہے۔ اس موقع پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے
کہ ممکن ہے کہ ایک بی بی کا حسن و جمال مرد کو دوسری بی بی کی نسبت اپنی طرف زیادہ مائل کر لیوے
اور اس حالت میں مرد اعتدال قائم نہ رکھ سکے۔ اور بلاشبہ یہ بات صحیح ہے لیکن مذہب اسلام پر اعتراض
امر ہے وارد نہیں ہو سکتا کہ اس میں نکاح آخر کی اجازت مرد کو اسی حالت میں ہے جبکہ مرد اعتدال
کر سکے ورنہ وہ فعل معصیت کا مرتکب ہوگا۔ اور درحقیقت یہ قید اعتدال بین الزوجتین کی ایسی سخت ہے

کہ ہر آدمی اس کو پورا نہیں کر سکتا۔ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے جو عدل و مساوات اپنی بیبیوں میں برتی یہاں تک کہ ہر ایک کے حجرے پر مٹی تول تول کر ڈالی۔ اس سے عام مسلمانوں کو تعدد نکاح کی مشکلات سے مطلع کر دیا اور یہ ایک منجانب اللہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حتی الامکان ایک ہی بی بی پر قناعت کرنا چاہیئے چنانچہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ فیصدی پانچ مسلمان بھی ایسے نہیں ہیں جو ایک سے زیادہ بیبیاں رکھتے ہوں۔

لیکن چونکہ سچا مذہب ایسا ہونا چاہیئے تھا جس میں ہر ایک موسم اور ملک اور ہر ایک مزاج کی رعایت ملحوظ ہو اس لئے یہ بات ضرور تھی کہ مرد ایک نکاح سے زیادہ کیواسطے ایک مناسب حد تک مطلقاً منع نہ کیا جاوے تاکہ ان مضرتوں کا بھی علاج باقی رہے جو ایسی منع کی حالت میں پیش آتیں۔ نیپولین بونا پارٹ اگر مسلمان ہوتا تو کبھی اس دقت میں نہ پڑتا۔ جو اس کو اپنی پہلی بی بی جوزی جنین سے اولاد نہ ہونے اور مریا لوئیا شہنشاہ اسٹریا کی دختر سے دوسرا نکاح کرتے وقت پیش آئی۔ نیپولین نے مجبور ہو کر اس قانون پر عمل کیا جو کارخانہ قدرت کے موافق اور مسلمانوں کے مذہب کے مطابق تھا۔

طلاق ان سب ناراضمندیوں کا آخر علاج ہے جس کے سبب سے کوئی گھر اور خاندان معرض پریشانی اور تباہی ہو ہم پوچھتے ہیں کہ انسان آخر بشر ہے میاں اور بی بی میں اگر کوئی ایسا رنج پیدا ہو گیا جس کا تدارک اور طرح پر ناممکن ہے تو کیا یہ مناسب ہے کہ دونوں اسی مایوسی اور پُر رنج حالت میں اپنی زندگی بسر کریں یا یہ مناسب ہے کہ دونوں اس رنج سے خلاص ہوں اور خوشی حاصل کرنے کی فکر کریں۔ مرد اگر کسی بی بی سے نہایت آزردہ ہو اور عدل قائم نہ رکھ سکتا ہو۔ تو وہ اپنی بی بی کو طلاق دیکر اس رنج سے خلاصی پا سکتا ہے بی بی دوسرا نکاح کر کے اس مایوسانہ حالت سے نکل سکتی ہے تاہم مذہب اسلام نے اس بات کی بہت کچھ روک تھام کی ہے کہ طلاق کی رسم عام نہ ہو جاوے اور ایسا مستقل رشتہ بات کی بات میں یا غصہ کی حالت میں منقطع نہ ہو جاوے اس لئے ایک یا دو مرتبہ اگر لفظ طلاق منہ سے نکل بھی جاوے تو بھی پھر رجعت ہو سکتی ہے اور تیسری دفعہ کی محتاج رہ جاتی ہے اور طلاق مغلظ کے بعد اگر میاں بی بی پھر آپس میں راضی بھی ہو جاویں۔ تو وہ اس وقت تک کافی نہیں جبتک کہ بی بی نے کسی غیر شخص سے نکاح کر کے طلاق نہ پائی ہو۔ یہ اس لئے کہ طلاق کوئی ہنسی کھیل نہ ہو جاوے اور مرد یہ خوب سمجھ لے کہ طلاق کے موثق ہو جانے کے بعد پھر کسی طرح وہ اپنی بی بی کو نہیں پا سکتا۔ اس لئے کہ عورت کا دوسرے مرد سے نکاح

کرنا اور پھر طلاق پانا نہایت شاذ ہے +

الغرض میاں اور بی بی کے تعلقات کو جیسا عمدہ مسلمانوں کے مذہب نے قایم کر دیا اور جس قدر رعایت اس بات کی کہ گھروں کے فساد دور رہیں زنا اور بدکاری سے مرد اور عورت دونوں محفوظ رہیں۔ اور بدسلوکی و بداخلاقی پاس نہ آنے پاوے۔ نبی اُمّی کی بدولت مسلمانوں میں برتی گئی ممکن نہیں کہ مسلمان اُس کا شکریہ ادا کر سکیں اور ناممکن تھا کہ بڑے بڑے عقلمند فی زمانا اور ماہران فن اصول قوانین بھی باہمی مشورتوں سے ایسے مختصر اور عام فہم لفظوں میں اور ایسی آسانی سے ایسے اصول قایم کر سکتے مگر افسوس ہے کہ اکثر مسلمان اپنے عمدہ مذہب کی اصلی خوبیوں کی طرف خیال نہیں فرماتے اور ایسی ایسی وحشیانہ اور ظالمانہ حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں جو بالکل خدا اور رسول کے حکم کے برخلاف ہیں اور جن کی نسبت ضرور ایک نہ ایک دن اُن سے بازپرس ہونی ہے اور اپنے اُن نامعقول افعال کو جن کے بیان کرنے سے شرم آتی ہے مذہب اسلام کے مطابق خیال کرنے سے مذہب اسلام کو داغ لگاتے ہیں اُن بیکس لڑکیوں کو جن کے کمبخت ماں باپ مصیبت اور قحط کے دنوں میں بیچ ڈالنے کے حیلہ سے چھوڑ جاتے ہیں شرعی لونڈیاں سمجھا گیا ہے کیا یہ غیرت کی بات نہیں ہے اور کیا یہ مسلمانوں کی رسوائی کا باعث نہیں ہے۔ اور کیا یہ آفت اس لائق نہیں ہے کہ مسلمان اُس سے اجتناب کریں اور اعتدال سے نہ گذریں +

حاصل یہ کہ مذہب اسلام کے بموجب تمام برتاؤ دانے سے لیکر اعلےٰ تک نہایت اعتدال کے ساتھ ہے اور جب اُس سے تجاوز کیا جاتا ہے تب ہی خرابی پیدا ہوتی ہے بہت کم لوگ ہیں جو اپنے معاملات میں اعتدال برتتے ہوں اور خصوصاً ہندوستان میں تو افراط اور تفریط کی کوئی حد ہی باقی نہیں رہی نکاح کے علاوہ جس کا اوپر ذکر کیا گیا اور بہت سی باتوں میں بے اعتدالیاں ہوتی ہیں اور پھر مشکل یہ ہے کہ اُن بے اعتدالیوں کو بے اعتدالی نہیں سمجھا جاتا +

اب آج کل اس بات کا بہت کچھ چرچا ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کو شائستگی اور تربیت حاصل کرنا چاہیئے اور بڑے بڑے لوگ اس رائے میں ساعی ہیں اور بڑے بڑے پڑھے لکھے اُن اولوالعزم لوگوں کی کوششوں کے برخلاف ہیں اور ایک بڑا مناظرہ اور مناقشہ قایم ہوا ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ وہی ایک اصول جس پر تمام باتوں کا دارومدار ہے یعنی اعتدال دونوں فریق اُسی کو بھولے ہوئے ہیں +

ایک فریق تو شائستگی کے نام سے نفرت کرتا ہے اور اُس میں کوشش کرنے کو ضلالت اور

ارتداد بلکہ کفر کے قریب تک نوبت پہنچا دیتا ہے اس فریق نے دنیاوی ترقی کو مذہب اسلام کے بالکل برخلاف سمجھا ہے اس فریق میں سے فیصدی ننانوے آدمی خود دنیا میں مبتلا ہیں مگر بات کا منہ سے نکالنا عیب جانتے ہیں۔ خود ہر قسم کی کوشش مال و دولت اور نام و عزت کے حصول کے واسطے کرتے ہیں لیکن اس بات کو گوارا نہیں کرتے کہ کوئی شخص اس کو باقاعدہ حاصل کرنے کے واسطے کوشش کرے اور اوروں کو بھی وہ قواعد سکھلا دے +

دوسرے فریق نے برخلاف اسکے یہ سمجھا کہ شائستہ قوموں سے ملنے اور میل جول قائم رکھنے سے اپنی قوم بھی شائستہ اور مہذب ہو سکتی ہے اور یہ خیال اُن کا بالکل درست تھا لیکن انہوں نے جو طریقہ اس مقصد کے حصول کیواسطے اختیار کیا اور اب تک بھی بعض بڑے بڑے نامی مسلمان بعض وقت اُسی کی پیروی کرتے ہیں وہ ایسا خراب تھا کہ اس کے سبب سے اصل مطلب بھی فوت ہو گیا اور بجائے اسکے کہ سچے مسلمانوں کو اس مقصد کے حصول کی طرف کچھ رغبت ہوتی اور زیادہ نفرت ہو گئی اور دن بدن وہ نفرت ترقی پکڑتی جاتی ہے اور یہ ایک بڑی خرابی کی بات ہے اور کچھ شک نہیں کہ یہ تمام خرابیاں صرف اسی وجہ سے پیدا ہوئیں کہ مذکورہ بالا فریقین نے حد اعتدال سے بڑھا کر قدم رکھا +

مشہور بات ہے کہ بڑے بڑے قاضی القضات اور نیچی ڈاڑھیوں والے وہ مولوی صاحب قبلہ جو ہندوستانی ناچ ورنگ میں شریک ہونیکو نہایت ذلیل اور بیحیائی سمجھتے ہیں۔ اور بالکل سچ سمجھتے ہیں انگریزی ناچ ورنگ کی مجلسوں میں بے تکلف شریک ہوتے ہیں۔ اور اُس کو مصلحت وقت سمجھتے ہیں +

سلطان عبد العزیز خان سلطان رُوم کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اسی مصلحت کے لحاظ سے مع اپنے رؤساء اور اُمراء کے اُس بال میں (یعنی انگریزی ناچ ورنگ کی مجلس میں) شریک ہوا جو سفیر انگلستان نے شاہزادہ ولیعہد بہادر انگلستان کے قسطنطنیہ میں تشریف لانے کے وقت اپنے اظہار مسرت کے واسطے دیا تھا۔

اب اس موقع پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اولی یہ کہ ایسے ناچ ورنگ کی مجلس میں بموجب مذہب اسلام کے شریک ہونا جائز ہے یا نہیں۔ دوم یہ کہ اگر ناجائز ہے تو موجودہ وقت کی مصلحت کے لحاظ سے اُس میں شریک ہونا جائز ہے یا نہیں۔ شق اوّل کی نسبت تو مجھ کو اس لئے کچھ زیادہ بحث کرنا ضرور نہیں ہے کہ جو صاحب ان ناشائستہ حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں ابھی تک انہوں نے خود بھی اُس کو شرعاً مباح نہیں فرمایا ہے۔ شق ثانی کے لحاظ سے میں تسلیم کرتا ہوں کہ مصلحت وقت بھی

بلاشبہ ایک عمدہ بات ہے لیکن دیکھنا چاہیئے۔ کہ مذہب اسلام میں اتنی گنجائش ہے یا نہیں کہ مسلمان اپنے تمام افعال مذہب کی پابندی سے کرسکیں۔ اور کوئی خرابی پیدا نہ ہو۔ مجھ کو ایک بات یاد آئی۔ دہلی میں جب مولوی عبد القادر صاحب نے اس جہان سے رحلت فرمائی تو اُس خاندان کے دستور کے مطابق ان کا جنازہ صندوق میں رکھا گیا۔ اور اوپر سے اس پر شامیانہ تنا۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے جو ایک بے نظیر شخص گذرے ہیں۔ مولانا شاہ عبد العزیز صاحب قدس سرہ العزیز سے اس بات کی درخواست کی کہ صندوق اور شامیانہ کی شرع میں کچھ اصلیت پائی نہیں جاتی۔ یہ دونوں بدعتیں موقوف کی جاویں۔ مولانا صاحب نے شامیانہ تو موقوف کر دیا اور صندوق کی نسبت یہ جواب بھیجا کہ اس کی اصل ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے جنازہ کو ان کے بیٹوں نے صندوق میں رکھا تھا۔ یہ جواب سُنکر مولوی اسمٰعیل صاحب سے نہ رہا گیا۔ اور اُنہوں نے علانیہ یہ فرمایا کہ کیا مذہب اسلام اب اس قدر تنگ ہوگیا۔ کہ اُس میں جنازہ اٹھانے تک کے پورے پورے احکام نہیں ملتے۔ جو ہم اور انبیاء ماسبق علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شریعت کی طرف رجوع لاویں شاہ صاحب اپنے بھتیجے کی یہ بات سنکر پسینا پسینا ہوگئے۔ اور مشہور ہے کہ اس دن کے بعد سے یہ سب رسمیں اُس خاندان میں سے موقوف ہوگئیں۔

جو صاحب مصلحت وقت کے حیلہ سے انگریزی ناچ و رنگ کی جلسوں میں باوجود مخالفت شریعت کے بے تکلف شریک ہوتے ہیں۔ اُن کا مطلب معاذ اللہ یہ ہوتا ہے کہ مذہب اسلام میں کوئی ایسا قاعدہ مقرر نہیں ہے جس کے ذریعہ سے مسلمان غیر قوموں سے اپنا معاملہ اتفاق کے ساتھ قایم رکھ سکیں اور اپنا اعتبار اور اعزاز غیر قوموں کی نظروں میں پیدا کر سکیں ان مصلحت دشمن مسلمانوں کی نسبت یہ کہنا مناسب ہے کہ یا وہ پکے مسلمان نہیں یا اُنہوں نے مسلمانوں کے مذہب کی تمام خوبیوں کو اچھی طرح نہیں سمجھا ہے پس ایسی رائے رکھنے والے پر سوائے افسوس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی مولوی ہو یا کوئی قاضی القضات یا کوئی سلطان وقت ہم کو اِن میں سے کسی کی خلاف شرع مصلحت اندیشی کی تقلید کرنا نہ چاہیئے۔

مسلمانوں کے مذہب میں جس قدر اُن باتوں کی تقید ہے جن کے ذریعہ سے غیر قوموں میں مسلمانوں کا اعتبار اور اعزاز قایم رہے۔ ایسی شاید اور کسی مذہب میں نہ ہو۔ یہی نکتہ ہے۔ جس کی نسبت حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں۔ ؎

در میانِ شرع حکمت با ہزاراں اختلاف	نکتۂ ہرگز نشد فوت از دلِ دانائے تو

دغا اور فریب سے بچنا ہمارے مذہب کا نمونہ ہے ایک مرتبہ کسی صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھوڑا

چھوٹ گیا اور وہ صحابی خالی توبرہ اُس کو دکھلا دکھا کر اُس کے پکڑنے کی فکر میں ہوئے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن صحابی سے پوچھا کہ اس توبرہ میں کچھ ہے انہوں نے جواب دیا کہ کچھ نہیں ہے۔ آپ نے ارشاد کیا کہ اُس میں کچھ دانا یا گھاس ضرور ڈال لو ورنہ یہ فعل دغا اور فریب سے سمجھا جاویگا پس خیال کرو کہ جس مذہب کے بانی نے جانوروں کے ساتھ ایسی ایسی خفیف باتوں میں بھی دغا اور فریب کرنیکی یہاں تک احتیاط کی اُس نے انسانوں کے آپس میں کس قدر اُس کی تاکید کی ہوگی۔ پس یہ ایک ایسی عمدہ صفت ہے۔ کہ اس کی بدولت ہم غیر قوموں سے بہت اچھی طرح ملاپ کر سکتے ہیں۔ ہم کو چاہئے کہ ہم انکے سامنے جھوٹ نہ بولیں اپنی غرض کے واسطے اُن کو دھوکہ نہ دیں گو اپنا نقصان ہی ہوتا ہو بات جب کہیں سچی کہیں اور کام جو کریں صفائی دل اور نیک نیتی سے کریں وفائے عہد جس کی نسبت اللہ تعالےٰ مسلمانوں سے ارشاد فرماتا ہے۔ اوفوا بالعھد ان العھد کان مسئولا مسلمانوں کے لئے مذکورہ بالا مقصد کے حصول کیواسطے نہایت عمدہ قانون ہے۔ جو زمانہ مسلمانوں کے عروج اور کمال کا زمانہ گذرا۔ اُس میں بھی مسلمان اپنی اسی یکرنگی اور وفائے عہد کے سبب سے دنیا کی تمام قوموں کی نظروں میں معزز اور ممتاز تھے۔ مسلمان کبھی اپنے دشمنوں کو اس بات کا موقع نہ دیتے تھے۔ کہ مسلمانوں کی نسبت اس قسم کا الزام لگا سکیں ؂

حضرت ابو عبیدہ بن الجراح جو شام کی لشکر کشی میں مسلمانوں کی فوج کے سردار تھے انہوں نے ایک عیسائی حاکم سے صلح کی اور یہ عہد کر لیا کہ اہل عرب عہد نامہ کی مدت تک تمہاری سرزمین میں دست اندازی نہ کرینگے۔ عیسائیوں نے اس قرارداد پر پورا پورا عمل ہونیکے واسطے اپنی حد پر ایک مینار تعمیر کرایا اور اپنے حاکم کی تصویر اُس پر قائم کردی اہل عرب جب اس تصویر تک پہنچتے تھے تو ایفائے عہد کی غرض سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ ایک دفعہ کسی اتفاق سے اُس تصویر کی آنکھ میں کچھ نقصان آگیا۔ عیسائیوں نے اس کی شکایت کی کہ اہل عرب نے اس آنکھ کو ناقص کردیا ہے اور یہ ایک نقض عہد ہے۔ حضرت ابو عبیدہ یہ بات سنتے ہی کانپ گئے۔ اور اُن شکایت کرنے والوں کے سامنے اپنی دونوں آنکھیں کردیں۔ کہ اگر تمہارے گمان میں یہ کام ہماری طرف سے ہوا ہے تو جونسی آنکھ تمہاری تصویر کی ناقص ہوگئی ہو وہی آنکھ تم میری ناقص کردو۔ کہ یہ تکلیف مجھ کو نقض عہد کے الزام عائد ہونے سے آسان تر ہے عیسائیوں نے مسلمانوں کے سردار کی اس ہمت پر آفرین کی اور اِس فعل سے باز رہے ؂

اب خیال کرنا چاہیئے کہ جو وفا حضرت ابو عبیدہ بن الجراح اور اُن کے ساتھ مسلمانوں کا

رضی اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین اس عمدہ صفت کے ذریعہ سے اُس وقت کے عیسائیوں میں ہوا کیا
سلطان روم اور اُس ملک کے امراء اور رؤساء کا وہی اعتبار اپنے اس فعل نامشروع کے ذریعہ سے
حال کی غیر قوموں کی نظروں میں ہوسکتا ہے حاشا کہ اُس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوسکتا سلطان نے اگر
یہ غلطی کی تو بہت بُرا کیا۔ اور مسلمانوں کو ہرگز اس کی تقلید مناسب نہیں ہے ہاں ہم نے جب اپنے مذہب کے
خلاف کام کر کے غیر قوموں میں اپنا اعتبار بھی پیدا کیا تو ہم کیا فیض کو پہنچ سکتے ہیں جن قوموں
کے خوش کرنے کے واسطے یہ وغیرہ اختیار کیا وہ بھی تو نادان نہیں جب وہ دیکھیں گی کہ ہم خلاف
شرع کام اُن کی خوشامد سے کرتے ہیں۔ تو وہ بھی ہم کو حقارت سے دیکھیں گی۔ اور جو رسوائی
ہم کو دنیا میں اور مسلمانوں کی نظروں میں اور عاقبت میں خدا اور رسول کے سامنے ہوگی وہ
اُس پر مستزاد ہے +

جو کام ہم اختیار کریں ضرور ہے کہ اُس میں ہر پہلو اور ہر جانب کا خیال کر لیں اور خصوصاً اپنے
مذہب کی طرف سے ہر قسم کی احتیاط کر لیں دنیا کی اصلاح مسلمانوں کے مذہب کے برخلاف نہیں ہے بلکہ عین مقصود
شارع ہے کچھ شک نہیں کہ خدانخواستہ اگر تمام مسلمان مفلس قلاش ہو جاویں تو مسلمانوں کے مذہب
کی بھی رونق باقی نہ رہیگی یہ سب اسی وقت ہے جب کسی ترقی دنیاوی سے ہم کو اپنے مذہب میں کسی
نقصان کے آنیکا اندیشہ نہ ہو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔ اعوذ باللہ من الغنی
المطغی و اعوذ باللہ من الفقر المکب یعنی اے اللہ مجھ کو پناہ میں رکھ ایسی دولت اور ثروت
سے جس سے آدمی گمراہ ہو جاتا ہے اور اے اللہ میں پناہ مانگتا ہوں ایسی تنگی اور محتاجی سے
جس سے آدمی چلا اُٹھے۔ خود خدا تعالےٰ نے ہم کو یہ دعا تعلیم فرمائی ہے۔ ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ و
فی الاٰخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار۔ پس یہ کون کہتا ہے کہ ہم کو اپنی دنیا کی اصلاح کی طرف متوجہ
ہونا ضرور نہیں ہے مگر ہاں اُس میں صرف اس قدر متوجہ ہوں کہ اپنے نماز روزہ کی طرف سے بھی غافل نہ ہو جاویں +
ہر ایک مسلمان اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ جوں جوں مسلمانوں کے قبضہ میں ملک زیادہ آتے گئے
مسلمانوں کی عزت اور اسلام کی رونق زیادہ ہوتی گئی اور پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جب خلفاء راشدین کی خلافت
کا زمانہ گذر گیا اور کچھ دنوں بعد مسلمان بادشاہوں نے غیر قوموں کی دیکھا دیکھی شاہانہ ٹھاٹ درست کئے
اور عیش و آرام میں اس درجہ مستغرق ہوئے۔ کہ مذہب کی طرف سے غافل بالکل ہو گئے وہی مفتوحہ
ملک اُن کے قبضہ سے رفتہ رفتہ نکلنے شروع ہو گئے ہیں نے یہ کیفیت صرف مسلمانوں کی بیان کی اور حقیقت
میں تمام قوموں اور سلطنتوں کا یہی حال ہوا جب اُن قوموں اور سلطنتوں میں اپنے اپنے مذہب کے خلاف

کام ہونے لگے۔ اُن سلطنتوں میں زوال آگیا۔ پس مسلمانوں کو ہر ایک ترقی اختیار کرتے وقت اپنے مذہبی ارکان کی طرف سے بہت ہوشیار رہنا چاہیئے۔ ؎

سنبھلکے رکھنا قدم دشت خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

عام محبّت

یعنی غیر مذہب والوں کے ساتھ محبت اور دوستی

آج کل ہندوستان کے مسلمانوں کے بعض مسائل کا تصفیہ اکثر اس مصلحت پر مبنی ہوتا ہے کہ غیر مذہب والوں کے ساتھ دوستی اور محبت شرعاً ممنوع ہے۔ بہت سی باتیں جن کو ہماری اصل شریعت نے مباح کر دیا ہے وہ اسی مصلحت کے لحاظ سے مذموم بلکہ ناجائز سمجھی جاتی ہیں۔ غیر مذہب والوں کے ساتھ کھانا اور پینا جو فی نفسہ مباح ہے اسی ایک مصلحت کے سبب سے متروک ہو رہا ہے یہاں تک کہ بعض مقدس مزاج اور محتاط طبیعتیں غیر مذہب والوں کے ساتھ آمد و رفت اور نشست و برخاست کو بھی پسند نہیں کرتیں۔ علماء اسلام کا یہ حال ہے کہ وہ دنیا اور مافیہا کے حالات سے تو مطلق آگاہی نہیں رکھتے۔ اُن کو یہ کچھ نہیں معلوم کہ اور ملکوں میں کیا ہو رہا ہے۔ اور ضرورت وقت کے لحاظ سے ہم کو کیا کرنا چاہیئے وہ نیک نیتی سے یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اگر غیر مذہب والوں سے اس قسم کی راہ و رسم جاری کی جاوے۔ تو اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ عوام اہل اسلام جو اپنے مذہبی مسائل سے ناواقف یا کم واقف ہوتے ہیں وہ غیر مذہب والوں کی صحبت میں خراب اور اپنے دین و مذہب سے منحرف ہو جاویں گے اس لئے وہ بالقصد مسلمانوں کو مباحات شرعیہ کے عمل میں لانے کی اجازت نہیں دیتے اور خود اس لئے ان کا استعمال نہیں کرتے کہ جو بات باپ دادوں سے نہیں ہوئی اُس پر جرأت کرنا مشکل ہے۔ اور جن عالموں کی ثابت قدمی اس مشکل پر غالب بھی آسکتی ہے وہ اس لئے ان مباحات سے کنارہ کر جاتے ہیں کہ ہم کو کرتا ہوا دیکھکر عوام بھی ویسا ہی کرنے لگیں گے اور پھر وہی خرابیاں آنے کی جس کا اندیشہ ہے۔ حالانکہ یہ اندیشہ بالکل غلط اور اس غلطی کا یہ علاج اور زیادہ غلط ہے۔ عوام کا عقیدہ جن کا عمل بالکل یؤمنون بالغیب پر ہے اس قدر پختہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات ہدایہ اور شرح وقایہ پڑھنے والے طالب علموں کو اپنے بعض مذہبی مسائل کی طرف تردد ہو جاتا ہے۔ مگر عوام کو کبھی خواب میں بھی کوئی تشویش لاحق نہیں ہوتی اور یقیناً یہی کیفیت اُن کی غیر مذہب والوں کی صحبت میں بھی باقی رہیگی نہیں عوام

کے خوف سے اپنے مسائل کو آزادی سے بیان کرنے میں تامل کرنا بلکہ ٹال جانا اور اُس کو اپنے وہمی اندیشہ کا علاج خیال کرنا حقیقت میں سخت الزام کی بات بلکہ گناہ اور معصیت میں داخل ہے۔ اور اپنی شریعت میں ایک قسم کی تحریف ہے +

اور ایسے عالموں اور عابدوں سے بھی زمانہ خالی نہیں ہے۔ اور اُن مباحات سے صرف اس غرض سے متمتع نہیں ہوتے کہ ہمارا تشخص اور تقدس صاحبانِ دول کے دلوں میں جو اُن کے مایۂ توکل ہیں۔ اور اُن کے باعث رونق ہیں قائم رہے۔ اس خیر گروہ کی دولت تو اب خدا کی عنایت سے روز بروز کامل ہوتی چلی جاتی ہے۔ اُمرا بھی اب اُن کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ اور اہلِ مذاق نے اپنی اصطلاح میں اُن کا لقب تحصیلدار رکھ لیا ہے۔ جو اوقات معیّن پر دورہ کرتے ہیں۔ اور اپنا نذرانہ معینہ وصول کر لے جاتے ہیں۔ اس مضمون میں ان تحصیلداروں کے اعمال و افعال سے کچھ بحث نہیں ہے۔ بلکہ گفتگو اوّل الذکر فرقوں کے خیالات سے ہے +

پس واضح ہو کہ محبّت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک محبّت من حیث الدین اور یہ وہ محبّت ہے جو مسلمانوں کے باہم صرف توحد مذہب کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ ایک مسلمان عالم اور دیندار جس کو پہلے ہم نے کبھی نہ دیکھا ہو۔ اسی محبّت کے سبب سے ہمارے نزدیک واجب التعظیم ہوتا ہے۔ اسی جوش مذہبی کے سبب سے اُس دیندار اور عالم کی محبّت ہمارے دل میں اثر کر جاتی ہے۔ پس یہ محبّت مسلمانوں کو صرف مسلمانوں سے ہو سکتی ہے اور مسلمانوں ہی پر منحصر نہیں دنیا میں جس قدر اہل مذاہب ہیں۔ اُن سب کی یہی کیفیّت ہے۔ کسی مذہب کا آدمی دوسرے مذہب والوں سے محبت من حیث الدّین پیدا نہیں کر سکتا +

دوسری قسم کی محبت وہ ہے جو امور معاشرت اور روزمرہ کے دنیاوی برتاؤ کے واسطے خدا نے آفرینش عالم کے ساتھ پیدا کی ہے۔ اور وہ ایسی ضروری شے ہے کہ نظام عالم کے بڑے بڑے ارکان اُسی پر منحصر ہیں یاں باپ کو اپنے بچوں سے بھائی کو بھائی سے میاں کو بی بی سے اور بی بی کو میاں سے اپنے خاندان والوں سے اپنے ہم محلہ سے اپنے شہر والوں سے اپنے ملک والوں سے اپنے ہمجنسوں سے اور اپنے مددگاروں اور اپنے محسنوں سے جو محبت ہر انسان کو ہوتی ہے وہ اسی دوسری قسم کی محبّت ہوتی ہے۔ البتہ محبت من حیث الدین اکثر اِس محبّت من حیث المعاشرت سے شامل ہو جاتی ہے برخلاف اس کے اگر ہم یہ دعوے کریں کہ ماں باپ کو اپنے بچوں سے اس لئے محبت ہوتی ہے۔ کہ بظن غالب آخر کو وہ اولاد اپنے ماں باپ کے مذہب کی پیروی کرینگے۔ تو اس بات کی کیا

وجہ ہوگی۔ کہ چوپایوں اور پرندوں میں بھی جو کچھ مذہب نہیں رکھتے ۔ ایسی ہی محبت پائی جاتی ہے جیسی انسانوں میں ہوتی ہے اِس سے صاف ظاہر ہے کہ محبت من حیث المعاشرت ایک دوسری قسم کی محبت اور ایک قدرتی اثر ہے جو محبت من حیث الدین سے بالکل علٰحدہ ہے ۔ لیکن یہ دونوں محبتیں باہم ایک دوسری کے مخالف اور ضد نہیں ہیں ۔ ایک جوش مذہبی جو انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے محبت من حیث الدین کو تو پیدا کر دیتا ہے ۔ لیکن محبت من حیث المعاشرت کو جو فی نفسہٖ ایک جدا شے ہے منقطع نہیں کرتا ۔ اور نہ اُس سچے جوش مذہبی میں یہ تاثیر ہوتی ہے ۔ کہ وہ کسی محبت من حیث المعاشرت کو ہم مذہبوں یا غیر مذہبوں سے منقطع کر سکے ۔

غالباً میرے اس اخیر بیان سے کہ جوش مذہبی محبت من حیث المعاشرت کو جو کسی غیر مذہب والے کیساتھ ہو منقطع نہیں کر سکتا ۔ کمتر شخص اتفاق کریں گے اِس وقت بیشتر لوگوں کی رائے یہی ہے کہ جوش ایمانی ایسی محبت کو دل میں جگہ نہیں دے سکتا وہ لوگ جوش ایمانی اور محبت من حیث المعاشرت کو جو غیر مذہب والوں سے ہو دو متضاد خاصیتیں بتلاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک کے ایجاب سے دوسری کا سلب لازم آتا ہے لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے اور جہاں تک مجھ کو تجربہ ہوا ہے میرے نزدیک ان کے اس دعوے کے لئے کوئی دلیل موجود نہیں ہے ایک جوش جو آجکل کے مسلمانوں کے اعتقادوں کے بموجب محبت من حیث المعاشرت کو غیر مذہب والوں سے منقطع کرتا ہے ۔ وہ حقیقت میں کوئی ایمانی جوش نہیں ہے ۔ وہ ان متعصبانہ خیالات کا جوش و خروش ہوتا ہے جن کو نور ایمانی سے کچھ لگاؤ نہیں ہوتا لیکن غلطی سے لوگ اُس کو مذہبی جوش سمجھنے لگے ہیں ۔ اور میں خود بھی پہلے ایک عرصہ تک جب تک خدا کے احکام پر غور سے نظر نہیں کی تھی ۔ ایسا ہی سمجھتا تھا ۔ لیکن جب اُس کو غور سے اور انصاف سے دیکھا تو اس جوش و خروش کو دھوکہ کے سوا اور کچھ نہ پایا ۔ اور ان لغو خیالات کی بنا ایک بڑی باریک غلطی پر نکلی چنانچہ اس مضمون میں ہم اُسی غلطی کو مفصّل بیان کریں گے ۔

غیر مذہب والوں کے سر میں سینگ نہیں ہوتے جن کی خلش سے ہم اُن سے نفرت کریں کوئی غیر مذہب شخص اگر علانیہ ہمارے مذہب یا ہمارے دین کے پیشواؤں کی نسبت دشنام دہی کرے ۔ تو بلاشبہ ہمارے دل کو سخت کڑوا معلوم ہوگا ۔ اور ممکن نہیں کہ ہم ایسے شخص سے محبت من حیث المعاشرت قائم رکھ سکیں یہ نفرت ہم کو اس کی بے تہذیبی کی وجہ سے پیدا ہوگی نہ اُس کی مغایرت مذہبی سے کوئی غیر مذہب شخص اگر فی الواقع ہم سے ذاتی نفرت کرتا ہو اور ہماری طرف سے اُس

کو دلی عناد اور تعصب ہو۔ تو ہمارے دل میں بھی اُس کی طرف سے سچی محبت کا اثر نہیں ہو سکتا۔ اور اس لئے ہم بھی اگر اُس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کریں جیسا وہ ہمارے ساتھ کرتا ہے تو کوئی زبان یا قلم ہم کو ملزم نہیں ٹھہرا سکتا اور اگر ہم سچائی اور راستبازی کا استعمال کریں اور اپنے ظاہری برتاؤ کو اپنی دلی کیفیت سے مطابق کریں تو یہ نہایت بہتر اور مردانہ کارروائی میں داخل ہے۔ وان تصبروا وتتقوا فان ذالک من عزم الامور۔ ان مذکورہ بالا کیفیتوں میں سے جب کوئی کیفیت نہ پائی جاوے اور کسی شخص پر سوائے دوسرے مذہب میں ہونے کے اور کوئی الزام نہ ہو۔ تو اُس سے بیٹھے بٹھلائے کی ناحق عداوت کی وجہ اس کے سوا شاید اور کچھ نہ ہو گی۔ کہ وہ ہمارے سچے مذہب کو جھوٹا سمجھتا ہے اور جس مذہب کو ہم بُرا جانتے ہیں وہ اُس کو اچھا جانتا ہے لیکن انصاف اور عقل کے نزدیک یہ وجہ ہرگز اس سے نفرت اور عداوت کرنیکے واسطے کافی نہیں ہے دوسرے شخص نے اگر ہمارے مذہب کو بُرا سمجھا تو ہم نے بھی اُس کے مذہب کو ایسا ہی خیال کیا ہے۔ ہم کو اگر یہ طیش ہے کہ اُس دوسرے نے ہمارے سچے مذہب کو بُرا خیال کیا ہے تو اُس دوسرے شخص کو بھی ایسا ہی طیش ہو گا۔ غرض کہ یہ ایک رائے کا اختلاف ہے۔ عداوت اور دشمنی کی کوئی وجہ اس سے پیدا نہیں ہوتی ✣

ایک شہر جس کی آب و ہوا درحقیقت نہایت عمدہ اور صحت بخش ہو کوئی دوسرا شخص اگر غلطی سے اس کو ناقص خیال کرے یا کوئی مریض کسی نہایت نافع دوا کے استعمال کرنے سے اس خیال خام سے باز رہے کہ دوا مضر ہے تو ایسی ناسمجھیوں پر بلاشبہ افسوس پیدا ہو گا نہ عداوت اور بغض ہمارا یہ خیال کہ وہ نادان شخص اُس عمدہ آب و ہوا کے مقام کو کیوں ناقص بتلاتا ہے! اور وہ مریض کیوں ایسی اچھی دوا کو استعمال نہیں کرتا یا ہمارا یہ خیال کہ کوئی غیر مذہب والا شخص ہمارے اس عمدہ مذہب کی پیروی کیوں نہیں کرتا۔ بالکل ایک سے خیالات ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ اوّل دو خیالوں سے ہم کو ایسی بےچینی پیدا ہو جو عداوت کے درجہ تک پہنچ جاوے۔ اور یہ اخیر خیال ہم کو ایسا بے آرام کر دیوے کہ ہم ایک لمحہ بھی کسی شخص کو غیر مذہب کی پیروی میں ترچھی نگاہوں بغیر نہ دیکھ سکیں ✣

یہ بےچین حالت اگر درحقیقت بہ لحاظ ایمانی اور جوش مذہبی سے کچھ علاقہ رکھتی تو ہماری یہ نسبت انبیاء کرام صلوات اللہ علیہم اجمعین اس حالت میں مستغرق رہنے کے زیادہ سزاوار تھے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں اس حالت کو پسند نہیں کیا بلکہ اُس سے منع کیا ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ

عزوجل ۔ وان کان کبر علیک اعراضھم فان استطعت ان تبتغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فتاتیھم بآیۃ ولو شاء اللہ لجمعھم علی الھدیٰ فلا تکونن من الجاھلین یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر تم کو کافروں کا اعراض کرنا ناگوار ہے تو اگر تم سے ممکن ہو تو زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی لگاؤ اور وہاں سے کوئی نشانی ان کے واسطے لے آؤ۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت دیتا پس تم نادان نہ ہو ؎

اس بےچینی کے علاوہ ایک بڑا سبب اس نفرت کا یہ بھی ہے کہ اکثر مسلمان یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ "ہم کو خدا تعالیٰ نے غیر مذہب والوں کے ساتھ دوستی اور محبت کرنے کو قطعاً منع کر دیا ہے جس طرح فرمایا خدائے پاک نے " لا تتخذ الکافرین اولیاء من دون المومنین۔ یا فرمایا کہ لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء یا ارشاد ہوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء۔ اسی طرح اور اکثر آیتیں اسی تاکید میں موجود ہیں جن کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو غیر مذہب والوں سے دوستی اور محبت کرنا بالکل منع ہے خواہ وہ یہود ہوں یا نصاریٰ یا مشرک" حقیقت میں یہ خیال بہت سے مسلمانوں کے دلوں میں اثر کر گیا ہے اور علماء زمانہ نے اس کو اور بھی غلط رلو کر دیا۔ اب سچی بات کا زبان سے نکالنا تک نہایت مشکل ہو گیا ہے ؎

مسلمان اگر غور و انصاف سے دیکھیں تو وہ صاف اس بات کو معلوم کرینگے کہ اگر درحقیقت مذہب اسلام کے مسائل کا ایسا ہی حال ہو جیسا اُن کا خیال ہے تو مذہب اسلام سے زیادہ مسلمانوں کے حق میں کوئی دوسری آفت اور وبال نہ ہوگا۔ جن غیر قوموں اور غیر مذہب والوں کیساتھ مسلمانوں کو بمقتضائے ضروریات بشری اپنا کاروبار جاری کرنا پڑتا ہے یا آئندہ پڑے یا جو غیر قومیں مسلمانوں پر حکمرانی کریں اُن کو مسلمانوں کی طرف سے رفاقت کی کیا اُمید ہوگی۔ اور کس بھروسہ پر وہ صفائی دل سے مسلمانوں کیساتھ معاملات میں راستبازی کرینگی۔ اور وقت پر اُن کی ضرورتوں کے سرانجام میں ان کی مددگار ہونگی ہمارے عالموں نے ایسی ضرورتوں کے لحاظ سے ایک شرعی حیلہ یہ تصنیف کر لیا ہے کہ ضرورت کے واسطے غیر مذہب والوں سے ضروری ملاپ جائز ہے۔ یہ راز گر اسرار تصوف کی طرح سینہ بسینہ چلا آتا تو شاید کچھ کام کا بھی ہوتا لیکن جب اس سے کتابیں مرتب ہوئیں اور چھاپی گئیں اور اس کی بنا قرآن پاک کی اس آیت پر قائم ہوئی۔ کہ الا ان تتقوا منھم تقاۃ۔ تو اب وہ راز مخفی نہیں رہ سکتا ؎ بیت

نہاں کے ماند آن رازے کزو سازند محفلہا

غیر قومیں کوئی احمق یا غافل نہیں ہیں جو ہمارے داؤں میں آجاوینگی۔ وہ ایسی اندھی نہیں ہیں کہ جب مسلمان اپنی ضرورتوں کے وقت اُنکے سامنے خوشامد اور جھوٹے اظہارات محبت اور دوستی سے پیش آویں تو وہ اُن کی اس منافقانہ کارروائی سے نفرت نہ کریں اور ہمارے اس خودغرض اور ذلیل طریقہ کے سبب سے ہم کو وہ ذلت کی نظروں سے نہ دیکھیں۔ یاد رکھنا چاہئیے کہ جبتک مسلمان صفائی قلب سے کسی قوم سے نہ ملیں گے تب تک وہ قوم ہرگز ہمارے شریک حال نہیں ہوسکتی نہ وہ ہمارے کسی کام میں مدد کرسکتی ہے اور نہ ہم سے صفائی کے ساتھ مل سکتی ہے *

اب خیال کرنا چاہئیے کہ جو حالت مسلمانوں کی ہندوستان میں اور نیز اور ملکوں میں بالفعل ہے وہ کس قدر غیر قوموں اور غیر مذہب والوں کی امداد اور دستگیری کی محتاج ہے اور جب یہ بات بھی ہمارے ایمان میں داخل ہے کہ خدا کو یہ سب کیفیت جو مسلمانوں پر اب طاری ہے۔ یا آئندہ طاری ہوگی۔ سب کچھ روز ازل سے معلوم تھی اور اُس پر بھی ہم ایمان لائے ہیں۔ کہ اب اَور کوئی نبی ہماری شریعت کی اصلاح کیواسطے یا کوئی دوسری شریعت لیکر نہ آویگا اور ہماری شریعت اب ہر طرح کامل اور مختم ہے۔ اور اُس شریعت کے وہی احکام صحیح فرض کئے جاویں جن سے ہم نے اوپر اختلاف کیا ہے تو گویا زبان حال سے ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں۔ کہ خدا کو باوجود اس تمام عظمہ و شان کے اتنی بھی لیاقت نہیں ہے جو وہ اپنے پیارے مسلمانوں کیواسطے ایسی شریعت مقرر کرتا جس کے احکام ہر وقت کی تبدیلیوں کے لحاظ سے اُن کی بقا عزت و آبرو اور اُن کی تمام ضروریات کے سرانجام کے واسطے کافی اور وافی ہوتے۔ اگر یہ نہیں تو دوسری بات یہ تسلیم کرنی پڑے گی کہ خدا نے ہم کو دھوکہ میں رکھا اور ہم کو ایک ایسی شریعت میں پھانسا جس کے احکام خود بخود ایک وقت میں ہماری تباہی اور بربادی کا موجب ہو جاویں۔ تمام اَور قومیں ہماری دشمن ہوجاویں اور ہر شخص حقارت کی نظر سے ہمارے اوپر تھو تھو کرے۔ نعوذ باللہ منہا *

مگر الحمدللہ کہ نہ ہمارا خدا ایسا بے وقوف ہے اور نہ ہماری شریعت غراء مصطفویہ ایسی مہمل شریعت ہے۔ ؎

ہرچہ ہست از شامتِ ناسازئی اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

ہمارا خدا جس نے اپنے سچے نبی کے ذریعہ سے اپنے پُر حکمت احکام ہماری ہدایت اور عمل کیواسطے بھیجے سب سے زیادہ دانا اور بینا اور حکیم ہے۔ اس حکیم مطلق نے جو شریعت ہمارے واسطے

مقرر کی وہ جیسی وسعت میں کامل ہے ویسی ہی برتاؤ میں سہل ہے اپنے برتاؤ کے لحاظ سے جیسی وہ شریعت ایک بہت عمدہ موسم میں کسی جوان آدمی کی جوانی کے مناسب حال ہے ویسے ہی ایک نامناسب موسم میں وہ ایک پیر وضعیف۔ مرد کی ضعیفی کے مناسب ہے اپنی وسعت کے لحاظ سے وہ تمام گذشتہ شریعتوں سے فراخ تر ہے اس کی ہر حکمت اور نہایت آسان احکام کا یہ قدرتی اثر ہے مسلمان ہر ایک انقلاب کی حالت میں خوشی سے بسر کریں۔ مذہب اسلام کا ہرگز یہ منشاء نہیں ہے کہ کسی قوم یا مذہب والے کی طرف سے دل میں عداوت اور کینہ اور بغض قائم کیا جاوے جو بالکل انسانیت کے برخلاف ہے قرآن شریف کی تمام مذکورہ بالا آیات کا مطلب یہ ہے کہ جو غیر مذہب والے مسلمانوں سے دین کے معاملہ میں لڑتے ہیں۔ اور مسلمانوں کو اُن کے گھروں سے نکالا ہے اُن سے محبت اور دوستی نہ رکھنا چاہیئے اُن سے صرف اس قدر معاملت جائز ہے جس سے اپنا بچاؤ رہے اور یہ اخلاق انسانی کا ایک ایسا معتدل اصول ہے جس سے کسی مذہب کا آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ یہ کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا کہ دو لشکر جو آپس میں مقابل ہوں اُن میں سے ایک گروہ کے بعض لوگ دوسرے گروہ والوں سے دوستانہ راہ ورسم جاری کریں اور اپنے لشکر کی سب خبریں دوسرے لشکر والوں کو پہنچا دیں۔ اور لشکر کے ضعف اور غنیم کی قوت کا باعث ہوں۔ پس جہاں جہاں مسلمانوں کو غیر مذہب والوں کی دوستی سے منع کیا گیا ہے وہ سب اسی قسم کی دوستی اور محبت ہے نہ وہ دوستی اور محبت جو من حیث المعاشرت ایک انسان کو دوسرے انسان سے لازمی ہے:۔

فرمایا اللہ پاک نے قرآن بزرگ میں لا ینہاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین و لم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم و تقسطوا الیہم ان اللہ یحب المقسطین انما ینہاکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاہروا علی اخراجکم ان تولوھم ومن یتولہم فاولئک ھم الظالمون " یعنی اللہ تعالیٰ تم کو اس بات سے منع نہیں کرتا کہ جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں نہیں لڑے اور جنہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا اُنکے ساتھ تم احسان اور انصاف کرو بیشک اللہ انصاف والوں کو دوست رکھتا ہے اللہ جس بات سے تم کو منع کرتا ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ دین میں تم سے لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا تم کو تمہارے گھروں سے نکالنے میں اوروں کی مدد کی اُن سے دوستی کرو اور جو لوگ اُن سے دوستی کریں گے وہ ظالم ہیں " یہ آیت تمام آیات ترکِ موالات اور ترکِ وَاقفت وغیرہ

پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مذہب والوں کے تحائف قبول کئے اُن کی دعوتیں منظور کیں۔ جو بالکل محبت کے مقدمات ہیں۔ خدا نے ہم کو یہ اجازت دی کہ جن غیر مذہب والوں سے تمہاری دینی لڑائی نہیں ہے اُن سے ملو اور اُن کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ ہم کو اپنے مذہب کی رُو سے لازم ہے کہ جہاں ہم محکوم ہوں وہاں اپنے حاکم کی اطاعت کریں۔ اور جہاں غیر قوموں پر حاکم ہوں وہاں اپنے محکوموں کی واجبی رعایت کریں۔ اُن کی شراب کی ایسی ہی حفاظت کریں جیسی اپنے سرکہ کی اور اُن کے سوروں کی ایسی ہی نگہداشت کریں جیسی اپنے دُنبوں کی۔ ہم کو یہ بھی تاکید ہے کہ جب ہم کسی سے عہد کر لیں تو مضبوطی سے اُس پر قایم رہیں۔ کہ یہ سب باتیں مجموع من حیث المجموع باہم محبت اور دوستی کو مستحکم کرتی ہیں +

خدا نے خود ہم کو اس بات سے مطلع فرمایا ہے کہ نصاریٰ تمہارے ساتھ زیادہ دوستی کرینگے۔ کما قال ولتجدن اقربھم مودۃ للذین امنوا الذین قالوا انا نصاریٰ ذالک بان منھم قسیسین ورھبانا وانھم لا یستکبرون بعض دوستیاں اس قسم کی بھی ہیں کہ گویا ایک فریق دوستی کا اظہار کرے لیکن دوسرے فریق کو اُس سے کنارہ ہی کرنا اولے ہے لیکن خدا نے نصاریٰ کی اُس دوستی کی علت بھی بیان فرما دی تا کہ کسی کو شبہ نہ رہے۔ کہ وہ دوستی کس قسم کی ہوگی اور فرمایا کہ وہ اس واسطے تمہارے دوستدار ہونگے کہ اُن میں عالم ہیں اور درویش ہیں۔ اور وہ غرور نہیں کرتے یعنی اُن کی طرف سے یہ دوستی تمہاری نسبت کمال تہذیب کے سبب سے ہوگی جیسا عام دستور ہے کہ ایک مہذب انسان دوسرے مہذب انسان سے محبت اور دوستی سے پیش آتا ہے۔ پھر کیا مسلمان ایسے نامہذب اور وحشی ہو جاوینگے کہ جو فرقہ اُن کا دوست ہو۔ اور دوست بھی ایسا دوست جس کی دوستی کی خبر خدا نے ہم کو دی اُس کے ساتھ بھی وہ نفرت سے پیش آویں۔ کیا مسلمان کبھی انگلستان اور فرانس کے نصاریٰ کے ان احسانات کو بھول سکینگے جو کریمیا کی لڑائی میں اُن کی طرف سے مسلمانوں کی سلطنت اعظم نہیں ہیں۔ بلکہ مسلمانوں کی مذہبی عزت برقرار رکھنے اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں اسلام کا جھنڈا قائم رکھنے کے واسطے برتی گئی۔ اس لڑائی میں ہمارے یہ مددگار جن کو خدا جزائے خیر دے خاص اپنے مذہب یعنی روسیوں کے مقابلہ پر جنہوں نے ظلم پر کمر باندھی تھی۔ کندھے سے کندھا اور سینہ سے سینہ ملا کر لڑے اور جہاں ہمارا خون گرا وہاں انہوں نے اپنے خونوں کی بھی دھاریں بہا دیں اور ہمارے دشمنوں کو مغلوب کیا اور حرمین شریفین پر جن کا نام لے لے کہ ہمارے عالم وجد میں آجاتے ہیں۔ ہمارا قبضہ قائم رکھا

مگر یہ سب اس لئے ہوا کہ سلطان روم خلد اللہ ملکہ اپنے ان مددگاروں سے نہایت صفائی اور خلوص کے ساتھ دوستانہ ملا رہنجار ہا ہیں اس کے برخلاف اور علماء ناعاقبت اندیش کی مرضی کے مطابق کام ہوا غارت ہوگیا پھر کیا مسلمانوں پر یہ فرض نہیں ہے کہ جب کبھی خدانخواستہ اور نصیب اعدا کوئی موقع آوے تو جہاں ہمارے ان مددگاروں کے پسینا گرنیکا احتمال ہو وہاں اپنے خون کے نالے بہادیں اب ہم اپنے عالموں سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا ایسے ایسے معاملات کے بعد بھی دو مختلف قوموں کے باہم سچی محبت اور دوستی نہیں ہوسکتی۔ مگر افسوس جو شخص یہ بھی نہ جانتا ہو۔ کہ انگلستان اور فرانس کی مدد کیسی اور کریمیا کس جانور کا نام ہے۔ یا کس زبان کا لغت ہے۔ اور کجا روس اور کجا مکہ و مدینہ۔ وہ کیا خاک ان باتوں کا جواب دے سکتا ہے۔ ع

ایں از صدرے واز شمس یا زغہ نمے آید

خدا نے ہم کو اجازت دی کہ ہم اہل کتاب عورتوں سے نکاح کریں پس جو اولاد اُن عورتوں سے ہوگی کیا وہ اپنی ماؤں سے دلی پیار اور محبت نہ کرے گی معہذا جس قدر استحقاق بیبیوں کے خاوند پر ہماری شریعت کے موجب ہیں، اور جیسی کچھ رعایت اور محبت اور حسن اخلاق ہم کو مسلمان بیبیوں کے ساتھ برتنا چاہئے وہ سب ہم کو اُن اہل کتاب بیبیوں کی نسبت برتنا ضرور ہوگا ورنہ ہم گنہگار ہونگے پھر کیا یہ ہوسکتا ہے کہ وہی خدا غیر مذہب والوں سے ایسے ایسے رشتوں اور قرابتوں کو جن میں محبت ثواب اور ترکِ محبت گناہ ہو ہمارے لئے جائز کرے اور خود ہی ہمارے واسطے اُن قوموں کو ہمارا دوست ٹھہرادے اور پھر وہی خدا ہم کو یہ حکم دے کہ تم اُن سے بغض وعداوت کرو یہ خدائی کا ہے کو ہے۔ یونانیوں کی فلکیات یا لڑکوں کا کھیل ہے وھٰذا بہتان عظیم ۔

گر مسلمانی ہمین است کہ واعظ گوید
وائے گر در پسِ امروز بود فردائے

مسلمانوں کو یہ بات بھولنا نہ چاہیئے کہ قرآن شریف تمام کتب سماوی کا مصدق ہے جس میں انجیل کی اخلاقی ہدائتیں بھی شامل ہیں۔ اور یہ بھی اُن کو معلوم ہے کہ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ایک بڑی غرض یہ بھی تھی۔ کہ اخلاق انسانی اپنے حد کمال کو پہنچ جاوے مسلمان اس نبی برحق کی اُمت میں ہیں جس کی تعریف میں خدا ارشاد فرماتا ہے وانک لعلیٰ خلق عظیم اور جس کا خطاب رحمۃ للعالمین ہے۔ ہمارا مذہب تمام نیکیوں کا سرچشمہ اور ہر ایک قسم کے انسانی اخلاق کا مکمل اور متمم ہے پس مسلمانوں کو چاہیئے۔ کہ گذشتہ خیالات پر صلوات

کہ کر آئندہ ٹھیک ٹھیک خدا اور رسول کی مرضی اور منشاء کے مطابق کام کریں۔ ہمارا کمال اسی
میں ہے۔ کہ کوئی مسلمان ہو یا غیر مسلمان۔ دوست ہو یا دشمن۔ سب کے ساتھ ہم سلوک اور محبت
سے پیش آویں۔ اور جس محبت سے ابتک ہم اپنی ناسمجھی کے سبب سے محروم رہے ہیں آئندہ اس کے
حصول کیواسطے بدل کوشش کریں اور اس کہربائی اثر کو کام میں لادیں جو ہمارے سچے مذہب نے
ہم میں غیروں کو اپنی طرف مائل کرنیکی غرض سے رکھدیا ہے۔ اب مسلمانوں کو ضرور ہے کہ جس خانہ
بیماندار مصلحت کے اثر نے ہماری شریعت کے وسیع دائرہ کو وہ غیر مساوی حصوں میں تقسیم
کرکے ایک بہت چھوٹا حصہ ہماری بسر زندگانی کے قیدخانہ کیواسطے خاص کردیا ہے کہ اسی میں
چاہئیں ہم مریں چاہیں ہم زندہ رہیں اس مصلحت خلاف کو درمیان سے اٹھاکر اور تنگ قید سے
آزاد ہوکر اپنی شریعت کے پورے دایرہ کی وسعت میں خوشی اور خورمی سے گلگشت کریں۔
اور ان خداداد نعمتوں پہ اپنے خدا کا شکر ادا کریں۔

مہمان و میزبان

مہمانی اور میزبانی کی خوبیاں اور برکتیں ایسی صریح اور صاف ہیں کہ اُن کے بیان کی کچھ حاجت
نہیں ہے۔ آپس میں محبت اور ارتباط بڑھانے کے واسطے یہ رسم بہت ہی مؤثر ثابت ہوئی ہے
اس رسم سے غیر بھی اپنے ہو جاتے ہیں۔ بلکہ دشمن بھی دوست بنجاتے ہیں اور اسی کے جاری نہ رہنے
سے قریب تر عزیزوں کی قدرتی محبت میں بھی کمی آجاتی ہے۔ پس جب یہ اس قدر مفید ہو مناسب
ہے کہ وہ ہر ایک قسم کے نقصانات اور خرابیوں سے پاک و صاف رہے ورنہ اسکے تمام فائدے
برباد ہوجاوینگے۔ لیکن جس طریقہ پر اس عرصہ میں ہم لوگوں میں مہمانی اور میزبانی ہوتی ہے
وہ کچھ مفید نہیں ہے بلکہ اعتراض کے قابل ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ موجودہ رسم و رواج کے
سبب سے اکثر اوقات مہمان اور میزبان دونوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ مسلمان
موجودہ طریقہ مہمانی اور میزبانی پر غور کریں۔ اور جس قدر اصلاح اس میں ضروری ہو وہ عمل میں لادیں۔

اب ہم اُن خرابیوں کا بیان کرتے ہیں جو قابل اعتراض ہیں سب سے بڑی غلطی جو اکثر
مسلمانوں کیطرف سے ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے میزبان کو پہلے سے اپنے آنے کی خبر نہیں کرتے
حالانکہ اس بیخبر وارد ہونے سے میزبان کو بڑی تکلیف ہوتی ہے اور خود مہمان کو بھی تکلیف اٹھانی
پڑتی ہے۔ علاوہ اس کے اس طرح پر بے خبر کسی کے مکان پر بطور مہمان کے وارد ہونا اخلاق

تہذیب بھی ہے +

اکثر یہ ہوتا ہے کہ گھر والے کھانے سے فارغ ہو جاتے ہیں اس کے بعد مہمانوں کی آمد ہوتی ہے اور اُس وقت ایک تازہ تشویش پیش آتی ہے ادھر تو کھانیکا کچھ سرانجام نہیں ہوتا اور ادھر یہ خیال ہوتا ہے کہ مہمانوں کے واسطے کھانے میں دیر نہ ہو۔ نوکر چاکر جن کو دوبارہ پھر چولھا جھونکنا پڑتا ہے جداول میں ناخوش ہوتے ہیں اور اگر کبھی رات کو ناوقت یہ مہمان داری پیش آگئی تو اور زیادہ مصیبت آتی ہے اور یہ آفت خاص کر اُن مقامات میں زیادہ آتی ہے جو ریل کے اسٹیشنوں سے قریب ہیں۔ اب یہ ہوتا ہے کہ رات کے گیارہ بارہ بج گئے ہیں یا رات ڈھل گئی ہے اور پچھلا پہرہ ہے سب لوگ اپنے آرام کی نیندیں لے رہے ہیں۔ کہ یکایک دروازہ پر سے آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ کواڑ کھولو۔ کواڑ کھولو پھر بعض سونیوالے ایسے غافل سوتے ہیں کہ بمشکل سے جاگتے ہیں یا دروازہ سے بہت فاصلہ سے ہوتے ہیں یا جاڑوں کے موسم میں مکانوں کے اندر کواڑ بند کرکے سوتے ہیں ایسی صورت میں بیخبر آنیوالے مہمان کو گھڑیوں پکارنے پکارتے اور چلاتے چلاتے اور کواڑ کھٹکھٹاتے اور زنجیریں ہلاتے گذر جاتے ہیں۔ اور جب ان تمام مشکلات کے بعد کواڑ کھلا اور صاحب خانہ بھی بڑی بے مزگی اور تکلیف کے ساتھ جگایا گیا تو اب خیال کر لینا چاہئے کہ اس غریب پر اُس وقت کیا گذرتی ہوگی۔ پھر کبھی یہ ہوتا ہے کہ مکان مختصر ہے یا اُس میں پہلے سے اور مہمان فروکش ہیں اور مکان میں زیادہ جگہ نہیں ہے یا صاحب خانہ کسی ایسی تشویش میں ہے۔ کہ اُس کو اپنے مہمانوں سے باطمینان خوشی سے ملنے کی فرصت نہیں ہے ان تمام باتوں کے لحاظ سے ضرور ہے کہ اپنے آنے سے قبل اپنے میزبان کو حتی الامکان اطلاع دیجاوے۔ اور نہایت صفائی قلب اور دوستی کی بات یہ ہے کہ اگر کسی وقت میزبان یہ اطلاع دے کہ مجھ کو ملنے کی فرصت نہیں ہے تو بغیر کسی ملال خاطر کے اپنے ارادہ کو ملتوی کرنا چاہئے۔ میں نے بعض اوقات یہ بھی دیکھا ہے کہ ایسے میزبان نے اپنی تکلیف بچانے کے واسطے یا مہمان کے آرام کی نظر سے مہمان کو کسی اور مکان میں اُتارا تو مہمان نے دل میں بہت ہی بُرا مانا حالانکہ میزبان کا یہ برتاؤ کسی طرح اعتراض کے لائق نہیں ہوتا بلکہ بڑی عمدہ بات خیال کی جاتی ہے +

بعض لوگوں کا یہ خیال ہوگا کہ جن خرابیوں کا ذکر اس مضمون میں ہے وہ صرف اُس حالت سے متعلق ہیں جبکہ مہمان اور میزبان میں باہم نہایت دوستی نہ ہو مگر یہ خیال غلط ہے اسلئے کہ یہ ایسے امور ہیں جو بطور واقعات کے پیش آتے ہیں جن میں زیادہ دوستی ہوتے یا نہ ہونے کو کچھ مداخلت نہیں ہے +

کبھی اس بیخبر آنیکا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اصل مقصود فوت ہو جاتا ہے جس سے ملنا مقصود ہوتا

ہے وہ مکان پر نہیں ملتا اور زیادہ افسوس اُس وقت ہوتا ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی یا ابھی آپ کے تشریف لانے سے تھوڑی ہی دیر پہلے فلاں مقام کو سوار ہو گئے اور تب حسرت کیساتھ وہاں سے لوٹ جانا ہوتا ہے اور یہ ایک کافی سزا اپنے بلا اطلاع آنے کی اُس وقت آنے والے کو مل جاتی ہے۔

اُس بیخبر آنے کے علاوہ چند اور خرابیاں بھی بیان کے لائق ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ بعض میزبانوں کے مزاج میں تکلیف اس قدر ہوتا ہے کہ اُن کا مہمان بھی تنگ آجاتا ہے۔ ان تکلفات کی وجہ سے کھانا اکثر دیر میں ملتا ہے اور تکلیف ہوتی ہے اور میزبان کو بھی زیادہ عرصہ تک اپنے عزیز مہمان کا قیام ناگوار معلوم ہونے لگتا ہے اور اُس کے آنے کی وہ ساری خوشی اُس کی موجودگی ہی میں جاتی رہتی ہے۔

سعدی علیہ الرحمۃ کسی مقام پر اپنے ایک دوست کے ہاں مہمان ہوئے اُنکے دوست نے بہت اہتمام سے اُنکی مہمانداری کی بہت تکلیف سے کھانے پکوائے اور بڑی شان کیساتھ دسترخوان چنا گیا شیخ نے جب یہ سامان دیکھے تو بے اختیار اُس کی زبان سے یہ نکلا ہائے دعوت شیرازہ صاحب خانہ یہ سمجھا کہ دعوت کے اہتمام میں کچھ کمی رہی اس لئے اُس نے دوسرے تیسرے وقت میں بیش از بیش اہتمام کیا لیکن ہر مرتبہ شیخ نے وہی افسوس ظاہر کیا آخر شیخ نے جب دیکھا کہ اب میزبان کو بہت تکلیف ہوتی ہے تو اس نے اپنی اقامت کو مختصر کیا اور میزبان سے رخصت ہو گیا کچھ عرصہ بعد اتفاقاً اُس میزبان کا گذر شیراز میں ہوا اور شیخ کے ہاں اُترا اور دل میں اس بات سے بہت خوش تھا کہ اب شیراز کی دعوتوں کا اہتمام دیکھنے میں آوینگے۔ جب کھانیکا وقت آیا تو شیخ گھر میں گیا اور وہاں سے وہی روزمرہ کا سیدھا سادھا کھانا لے آیا اور اپنے دوست کے سامنے رکھدیا اور کہا کہ بسم اللہ کیجئے۔ اُس وقت شیخ کے دوست کو بہت ہی حیرت ہوئی اور اُس نے آہستہ آہستہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کھانا شروع کر دیا۔ شیخ نے اُس کی حیرت کو دیکھکر کھانا کھا چکنے کے بعد اُس سے کہا کہ اے دوست دعوت شیراز سے میرا یہی مطلب تھا۔ تم نے میرے واسطے بہت سا تکلف کیا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر میں زیادہ قیام کرتا تو تم کو سخت ناگوار گذرتا اور میری مہمانی خوشی کی جگہ ملال سے مبدل ہو جاتی اس لئے میں نے اُس وقت مجبور ہو کر اپنی مدت اقامت کو مختصر کیا اور جس غرض سے میں وہاں گیا تھا وہ بھی پوری نہ ہوئی نہ میں اچھی طرح وہاں ٹھہر سکا نہ سیر کر سکا اور جلدی سے رخصت ہوا یہاں اب آپ جس قدر مدت تک چاہیں قیام کریں جتنے روز آپ رہینگے میری خوشی بڑھتی جاویگی۔

میرا مطلب اس حکایت سے یہ نہیں ہے کہ اپنے دوستوں کی مہمانی کے زمانہ میں اُن کی خوشی خاطر کے لئے مطلق توجہ نہ کی جاوے نہیں بلکہ میرا یہ مطلب ہے کہ جو کچھ کیا جاوے ایسے اعتدال سے کیا جاوے۔ جو آئندہ نبھ سکے اور مہمان کے قیام سے سوائے خوشی کے دوسری بات حاصل نہ ہو۔

ان تکلیفات کے علاوہ ایک اور اہتمام بھی جو اکثر عمل میں آتا ہے مہمان اور میزبان دونوں کے لئے سخت تکلیف کا باعث ہوتا ہے اور وہ مہمان اور میزبان کا ساتھ کھانے پر اصرار کرنا ہے اگر اتفاق سے اُن میں سے کوئی باہر کو چلا گیا اور آنے میں دیر ہوئی تو دوسرے صاحب اُنکے منتظر رہتے ہیں! و کھانا نہیں کھاتے اور جب زیادہ دیر ہوتی ہے تو جی میں نہایت تنگ ہوتے ہیں۔ تلاش کیواسطے چاروں طرف کو آدمی دوڑائے جاتے ہیں اور جب بڑی ہی دیر کے بعد دوسرے صاحب آئے تب کھانا نصیب ہوتا ہے۔ اگر اتفاق سے کسی صاحب خانہ نے بلا انتظار اپنے مہمان کے کھانا کھالیا اور مہمان صاحب بعد کو آئے تو بہت کم مہمان اس مزاج کے ہوتے ہیں جو میزبان کی اس حرکت سے ناراض نہ ہو جاتے ہوں میں نے خود ایک دفعہ یہ دیکھا ہے کہ ایک مہمان جو باہر کو گئے ہوئے تھے جب وہ ایک بجے تک بھی نہ آئے اور صاحب خانہ نے ظہر کی نماز بھی پڑھلی تب مجبور ہو کر بلا انتظار مہمان کے کھانا کھالیا اُس کے بعد مہمان صاحب سیر کر کے بھوکے پیاسے واپس تشریف لائے اور تھک کر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے کہ آج تو مر مٹے جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ بھوک بھی اُن کو لگی ہوئی ہے اور بشرہ سے بھی ایسا ہی ظاہر ہوتا تھا لیکن جب انہوں نے یہ سُنا کہ صاحب خانہ نے کھانا کھانے میں میرا انتظار نہیں کیا تو نہایت ہی بُرا مانا یہاں تک کہ کھانا بھی نہ کھایا اور یہ عذر کر دیا کہ میں کھا چکا ہوں ایک دوست مل گئے تھے اُنہوں نے بغیر کھانا کھلائے نہ اُٹھنے دیا اب غور کرنا چاہیے کہ ان حماقتوں کا کیا نتیجہ ہوگا۔ کیا اس مہمانی اور میزبانی سے کچھ محبت اور خوشی بڑھ سکتی ہے۔

ایک اور خراب طریقہ یہ ہے کہ مہمان کو کوئی موقع تخلیہ اور آرام کا نہیں ملتا اور یہ خرابی دو وجہ سے پیدا ہوتی ہے اول اس لئے کہ ہمارے مکانات کا طرز خراب ہوتا ہے دوم ملنے جلنے کا طرز بھی اچھا نہیں ہے ہمارے مکانات اس طرح پر علیحدہ علیحدہ حصوں میں تقسیم نہیں ہوتے کہ ہر ایک شخص کے لئے بغیر اس کے کہ اوروں کو تکلیف ہو آرام کیساتھ تخلیہ ممکن ہو ایک ہی کھلا ہوا مکان ہوتا ہے وہی اپنے بیٹھنے اُٹھنے کا وہی مہمانوں کے قیام کا۔ اگر کوئی بیمار ہے تو اُسی مکان میں پڑا ہے جیسے تردد کے نیچے تال بھی کا بھی اسی کے سامنے چڑھا ہوا ہے ایک طرف کو ملاں لڑکے بھی اُسی مکان میں پڑھا رہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ اور اس لئے صاحب خانہ مجبور ہوتا ہے اور اپنے مہمان کے لئے کوئی موقع تخلیہ کا آسانی سے موجود نہیں کر سکتا اس خرابی کا دور کرنا بالفعل غربا اور متوسط الحال شخصوں کے اختیار سے

ہاں ہے لیکن امرا کو اس طرف توجہ کرنا ضرور ہے چنانچہ بعض امرا اپنے نو تعمیر مکانوں میں اس قسم
کی رعایتیں اب ملحوظ رکھتے ہیں۔ یا اُنکے متعدد مکانات ہوتے ہیں جن کی وجہ سے یہ دقتیں اُن کو
کمتر پیش آتی ہیں لیکن اکثر امرا کو اب تک بھی اس طرف توجہ نہیں ہے اور اُن کی پچاس پچاس ہزار
اور ایک ایک لاکھ روپیہ کی عمارتیں اب تک بھی اکثر اُسی پرانے نقشہ پر بنائی جاتی ہیں جن میں نہ سردی کا
آرام نہ گرمی کا نہ مہمان کے لئے کوئی تخلیہ جو ممکن طلب ہے لئے پس اگر امرا اس طرف توجہ کریں تو آخر کار
متوسط الحال شرفا بھی اُن کی پیروی کریں۔ اور رفتہ رفتہ غربا بھی حتی الامکان اُنہیں کی
تقلید کرنے میں ساعی ہوں +

ایک اور تکلیف مہمان اور میزبان کے طرز ملاقات سے پیدا ہوتی ہے۔ جس وقت مہمان کسی اپنے
دوست یا عزیز و قریب کے مکان پر وارد ہوا صاحب خانہ اور اُس کے عزیز و اقارب اور دوست و آشنا سب
اس مہمان غریب کے گرد ہوئے اور گھڑیوں اور گھنٹوں بلکہ پہروں اس کے پاس بیٹھنا شروع کیا۔ ایک
صاحب اُٹھکر تشریف لے گئے تو دو صاحب اور موجود ہوئے۔ غرض ہر وقت یہ جلسا اس کے پاس رہنے لگا۔ اب
جتنا کوئی مہمان کسی کو عزیز ہوا اُسی قدر یہ اہتمام زیادہ ہوتا ہے اور زیادہ عزیز کی مٹی زیادہ خوار ہوتی ہے
بہت ہی کم ہم سے اول ایسے بے تکلف مہمان ہوتے ہیں۔ جو اس جم غفیر کا کچھ ادب اور لحاظ نہیں کرتے
اور اپنے آرام میں خلل نہیں ڈالتے اور میزبان بھی ایسے بہت کم ہیں جو اپنے مہمان کی تکان راہ اور
صعوبات سفر کے لحاظ سے اُس کے آرام و آسائش کا خیال کرتے ہوں۔ اور بخوشی خاطر اُن کو ایسا
موقع دیتے ہوں کہ جب تک وہ چاہیں آرام کریں۔ اور خط و کتابت وغیرہ کا جو کچھ شغل وہ چاہیں تخلیہ
میں اطمینان کے ساتھ کرسکیں۔ ایک اور بڑی مشکل یہ ہے کہ مہمان بھی چونکہ ہماری ہی جنس سے ہوتے
ہیں۔ اور اسی قسم کے تپاک اور طرز ملاقات کے عادی ہوتے ہیں اس لئے ایسا بھی اکثر ہوتا ہے کہ اگر
کوئی میزبان یا میزبان کا کوئی عزیز و قریب اپنے مہمان کے پاس زیادہ حاضر نہ رہے تو مہمان صاحب بھی بُرا
مان جاتے ہیں۔ اور حماقت سے یہ سمجھکر کہ ہماری کچھ قدر و منزلت نہ ہوئی خود اپنی نظروں میں حقیر اور
تھوڑے تھوڑے ہونے لگتے ہیں۔ اس لئے صاحب خانہ اپنے مہمان کے سر پر ہر وقت ایک سد بک بک کر جوالا
پہرہ متعین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اب دیکھنا چاہئے کہ یہ کیسی کچھ ذلت اور تکلیف کی بات ہے اور چونکہ
ہم خواہ بہ حیثیت مہمان اور خواہ بہ حیثیت میزبان اسی قسم کی تکلیفیں جھیلنے کے عادی ہو رہے ہیں۔
اور اپنے بیش بہا وقت کو رائگاں کھونے میں نہایت مشاق ہیں۔ اس لئے یہ برتاؤ ہم کو کچھ زیادہ ناگوار
نہیں گذرتا۔ اور نہ وہ شخص جو اپنے وقت کی کچھ بھی حفاظت کرتا ہو ایک دن کیونکر اسطرح بھی کبھی کسی کے

ہاں اس طرح مہمان ہو کر ایسے کسی طعنہ شاہ کا میزبان ہو کر خوش نہیں رہ سکتا +

مہمانی اور میزبانی کی ان تمام مذکورہ بالا مصیبتوں کے علاوہ اور بہت سی ایسی ہی بیہودہ باتیں ہیں جو ہم لوگوں میں رائج ہیں۔ اور جن کے بیان کرنے کے واسطے ایک مستقل رسالہ مرتب ہونا چاہیئے۔ اس لئے میں اُن کی طول و طویل تفصیلوں میں پڑنا ضروری نہیں سمجھتا اور میں خیال کرتا ہوں۔ کہ اگر وہ بڑی بڑی خرابیاں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا رفع ہو جاویں تو اور چھوٹی چھوٹی خرابیاں بھی جو اُنہیں بڑی خرابیوں سے پیدا ہوتی ہیں خود بخود رفع ہو جاویں گی لیکن ختم مضمون پر اس نمانہ مصیبت کا تذکرہ البتہ مناسب ہے جو مہمان کو رخصت کیوقت فرمان واجب الاذعان آمدن بہ ارادت و رفتن بہ اجازت سے پیش آتی ہے +

مہمان شاید ڈرتے ڈرتے اور نگاہیں نیچی کرکے صاحب خانہ سے رخصت ہونیکی اجازت چاہی مگر صاحب خانہ نے صاف انکار کیا مہمان ہرچند منت کرتا ہے اور اپنی سخت سخت ضرورتیں بیان کرتا ہے لیکن صاحب خانہ راضی نہیں ہوتے اُس مجلس میں اور جس قدر صاحب موجود ہوتے ہیں وہ بھی اپنا فرض یہی سمجھتے ہیں کہ صاحب خانہ کی تائید کریں وہ بھی مہمان کو قیام کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اور اُن میں سے ایک متنفس بھی ایسا نہیں دکھلائی دیتا جو خدا لگتی ہوئی کہے اور مہمان کی بیکسی پر بھی رحم کرے۔ کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ ابھی آپ کہاں جاوینگے کوئی فرماتے ہیں کہ خاں صاحب کا کھانا بیچ نہ ڈالئے خاں صاحب حرف رخصت سے سُنتا تیوری چڑھائے ہوئے فرماتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی تو آپ تشریف لائے اور آتے ہی جانیکی سُنائی آپکے اس آنے سے تو آنا بہتر تھا۔ دنیا کے کام چلے ہی جاتے ہیں یہاں آپ کب کب آتے ہیں۔ المختصر یہاں تک اُس مہمان کو تنگ کیا جاتا ہے کہ وہ سخت رنج میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے دل میں کہتا ہے کہ الٰہی میں کس عذاب میں آگیا اور کیونکر اس سے نجات ہوگی۔ اور اپنے آنے پر نہایت افسوس کرتا ہے اور قہر درویش بر جان درویش۔ ایک دو مقام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پھر کیا یہ قیام فریقین میں کچھ محبت اور خوشی کو بڑھا سکتا ہے نہیں ہرگز نہیں بڑھا سکتا۔ بلکہ برعکس اُس کے دلوں کو رنجیدہ کر دیتا ہے +

اگر کوئی سخت بے حیا مہمان ہوا اور اُس نے نالائقی سے اپنے مشفق میزبان کے اصرار پر کچھ خیال نہ کیا اور سمجھانے والوں کی بات بھی نہ مانی اور چلنے کا ارادہ مصمم کر لیا تو اب یہ خیال کسی طرح اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا کہ کھانا کھا کر جانا ہوگا۔ اور یہ اصرار خاصکر اُن مقامات میں مہمانوں کو مصیبت میں مبتلا کرتا ہے جہاں ریل کے اسٹیشن قریب ہیں۔ اور مسافروں کو ریل کے ذریعہ سے سفر منظور ہوتا ہے اکثر یہ ہوتا ہے کہ اثناء سفر میں کوئی دوست اپنے دوست سے ملنے کے واسطے کسی اسٹیشن سے قریب ہی [illegible]

اُترا اور یہ ارادہ کر لیا کہ دوسرے وقت کی ریل میں چلا جاؤنگا ایسے مسافروں سے بھی جب وہی معمولی تکلف آمیز جھگڑے اور قصے پیش آتے ہیں تو اُن کو سخت حیرانی ہوتی ہے -

اُدھر ریل کے وقت میں صرف ایک گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے یہاں صاحب خانہ کے ہاں نوکر بازار سے گوشت لیکر بھی نہیں لوٹا مہمان کہتا ہے کہ برائے خدا مجھ کو رخصت کیجئے لیکن صاحب خانہ اس میں اپنی نہایت ذلّت سمجھتے ہیں کہ بغیر کھانا کھائے یا کھانا ساتھ لئے مہمان گھر سے رخصت ہو - ایک کہ بھی بازار سے آگیا اور ریل کا وقت بھی بہت نزدیک پہنچا اور مہمان پر ایک سخت اضطراب کی حالت طاری ہوئی کبھی وہ اپنے اس خوف کو کہ ریل چلی جاویگی اور میں رہ جاؤں گا شرم سے ضبط کر کے چپکا ہو رہا - اور کچھ دیر کے بعد گھبرایا اور کئی دفعہ چلنے کے قصد سے اُٹھنا چاہا مگر صاحب خانہ نے نہ اٹھنے دیا - آخر جب وقت بہت ہی نزدیک آگیا اور صاحب خانہ کو بھی کچھ ندامت سی ہوئی تو وہ بھی جلدی سے اُٹھے نوکر بازار کو بھیجا گیا کچھ مٹھائی بازار سے آئی کچھ آدھا کچا آدھا پکا کھانا میزبان صاحب گھر میں سے لائے اور بہزار سرعت و شتابی مہمان نے دس پانچ لقمہ کھائے اور تھوڑا سا کھا کر اُٹھ کھڑا ہوا - میزبان صاحب اب بھی مصر ہوئے کہ آپ نے کچھ نہ کھایا اور کھلیئے غرض جس طرح سے ہوا وہ کمبخت مہمان صاحب خانہ سے رخصت ہوا سڑک پر دوڑ کر خدمتگار نے پان دیا اب مہمان صاحب بھاگم بھاگ اسٹیشن کو چلے راستہ میں ریل کی آواز سُنائی دی - اور بھی اوسان خطا ہوئے - گاڑی والہ سے تقاضا ہوا کہ جلدی چلو اور کچھ دور پہنچکر انعام کا بھی وعدہ کیا گیا اُس نے بھی بے تحاشا گاڑی دوڑائی اور ریل چھوٹنے سے بھی پہلے اسٹیشن پر پہنچا دیا اور کرایہ اور انعام لیکر علیحدہ ہوا - اسٹیشن کے مزدور چلائے کہ پہلی گھنٹی ہو چکی ہے جلدی چلو ٹکٹ گھر میں پہنچکر جلدی سے ٹکٹ لیا تھے میں دوسری گھنٹی بھی ہوئی میاں اور مزدور دوڑے جب ہی اسٹیشن کے اندر کے چبوترہ پر آئے تیسری گھنٹی ہوئی سیٹی بجی اور ریل نے آہستہ آہستہ آگے کو بڑھنا شروع کیا - اب مہمان کمبخت حیران کھڑا ہے اور حسرت کیساتھ ٹرین کی اُس نرم نرم رفتار کو دیکھ رہا ہے ! اسباب والے مزدوروں نے سمجھایا کہ میاں آپ ہی نے دیر کر دی - جانا تھا - تو گھڑی بھر پہلے سے آئے ہوتے اب چلو دوسرے وقت کی ریل پر جانا یہ سُنکر مہمان غریب لوٹا اور پھر گاڑی کرایہ کر کے میزبان صاحب کے مکان پر آیا - راستہ میں سو سو طرح کے غمگین خیالات نے اُس کو رنجیدہ کیا جب مہمان صاحب مکان پر آئے تو میزبان صاحب دُور سے دیکھتے ہی بے اختیار ہنس پڑے اور فرمانے لگے کہ کہئیے ریل پر ہو آئے - آپ نے تو کمال کر دیا کہ تھوڑی ہی دیر میں پہنچ بھی گئے اور پھر چلے بھی آئے - ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ آج نہ جاؤ ہمارا کہنا نہ مانا یہ اُس کی سزا ہے ٭

اب ہم اپنے ابنائے جنس سے اس طریق مہمانی اور میزبانی پر انصاف چاہتے ہیں۔ اور دریافت کرتے ہیں کہ آیا یہ طریقہ تبدیل اور ترمیم کے لائق ہے یا نہیں۔ کیا ایسے برتاؤ کی حالت میں کوئی مہمان خوشی سے کسی اپنے دوست کے پاس آنیکا ارادہ کریگا۔ یہ کونسی آدمیت ہے کہ اپنے عزیز مہمان کی تمام ضرورتوں کی طرف سے آنکھیں بند کرکے قیام پر جاہلانہ اصرار کیا جاوے۔ ایسی مصیبت کی حالت میں سفر کرنیوالوں کو انواع واقسام کی تکلیف ہوتی ہے۔ وہ اپنے کوچ ومقام کا کوئی انتظام اپنے اختیار سے نہیں کرسکتے۔ نہ اپنے وقتوں کی تقسیم پر قادر ہو سکتے ہیں۔ اور ان کے علاوہ بہت سے ہرج اور نقصان جو اس قسم کی مزاحمت سے پیدا ہوتے ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ ان کی وجہ سے بجائے ملاقاتوں کی خوشی کے ایک قسم کا ملال اور رنج پیدا ہوجاتا ہے۔ پس ہماری خواہش یہ ہے کہ ہمارے اس مضمون کے پڑھنے والے ہمارے اس مضمون پر انصاف سے غور کریں اور جو رسم ورواج اصلاح کے قابل ہیں اُن میں مناسب اصلاح کریں تاکہ مہمانی اور میزبانی کی خوشیاں اور زیادہ ہوں۔ اور مہمان یا میزبان کسی کو تکلیف نہ ہو۔ اور وہ اصلاحیں جیسا ہم نے اوپر مفصل بیان کیا ہے۔ مفصلہ ذیل مراتب میں ہونا چاہیئے ✣

اوّل حتی الامکان بلا اطلاع کسی کے ہاں آنے سے احتراز کرنا چاہیئے گو باہم کیسی ہی بے تکلفی اور یگانگت ہو جہاں تک ممکن ہو اس قدر پہلے اطلاع دیجاوے کہ جواب بھی آسکے ورنہ کم سے کم ایک دن پہلے میزبان کو اطلاع ہو جاوے۔ اگر بدرجہ مجبوری یہ بھی نہ ہو سکے تو رات کے وقت حتی الوسع کسی کے مکان میں پہنچنے سے کنارہ کیا جاوے۔ مگر جب ایسی کوئی سخت ضرورت پیش آجاوے ✣

دوم ۔ دعوت میں اس قدر تکلف نہ کرنا چاہیئے جس سے اپنے عزیز مہمان کا قیام آخرکار ناگوار معلوم ہونے لگے۔ بیچ بیچ کی چال ہمیشہ بہتر ہوتی ہے۔ وَخَیرُ الاُمورِ اَوسَطُہا ✣

سوم ۔ یہ خیال بھی کہ میزبان ومہمان عموماً ساتھ ہی کھانا کھاویں ترک کرنا چاہیئے۔ کھانے کے معمولی وقت پر اگر کوئی فریق غیر حاضر ہو تو اُس کی حاضری کا انتظار نہ کیا جاوے اور فریق غیر حاضر کو دوسرے فریق کی اس کارروائی سے آزردہ نہ ہونا چاہیئے ✣

چہارم ۔ تخلیہ کے موقع کا بھی جہاں تک ممکن ہو خیال رکھنا چاہیئے تاکہ مہمان اور میزبان دونوں کو آرام ہو ہروقت کے پاس اُٹھنے اور بیٹھنے سے تکلیف بھی ہوتی ہے اور ملاقاتوں سے بھی جی گھبرا جاتا ہے۔ اور اسی امر اور طرز عمارت کا بھی خیال کریں ✣

پنجم ۔ آمدن بارادت ورفتن باجازت کے غلط اصول کو بھی منسوخ کرنا چاہیئے۔ اور دونوں

باتیں آنے والے ہی کی مرضی پر منحصر کرنی چاہئیں۔ تاکہ ہر شخص اپنے کوچ و مقام کا انتظام ٹھیک ٹھیک کر سکے۔

انسان کی زندگی

انسان کی زندگی کی ٹرین بھی ریل کی ٹرین سے مشابہ ہے

ایک نوے برس کا صوفی مشرب بڈھا جس کو اپنے اس فانی زمانہ کی بہ نسبت ہمیشہ رہنے کے آنیوالے زمانہ کا زیادہ دھیان رہتا تھا ایک رات ریل میں سوار ہوا اُس کی ٹرین راستہ میں متعدد اسٹیشنوں پر ٹھہرتی اور مسافروں کو اتارتی اور سوار کرتی ہوئی پچھلی رات میں جبکہ چاندنی پھیکی پڑتی جاتی تھی۔ اس اسٹیشن پر پہنچی جہاں وہ بڈھا مسافر اترنے کو تھا۔ جیسے ہی ٹرین اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ انجن کی نرم نرم رفتار اور ٹرین کی سُریلی آواز سے ملی ہوئی یہ صدائیں اُس کے کان میں آئیں "ٹکٹ کھولو ٹکٹ کھولو" وہ بڈھا مسافر ان آوازوں کو سنکر چونک پڑا اور گذشتہ نوے برس کا زمانہ ایک دفعہ اور اس کی نظروں کے سامنے پھر گیا۔ اُس نے خیال کیا کہ اُسی طرح مرنے کے بعد ایک دن لوگوں سے اُن کے اعمال کا حساب طلب ہوگا۔ پھر جتنا جتنا وہ پیرمرد خیال کرتا اور فکر میں دوڑاتا تھا۔ اُسی قدر اُس کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کی زندگی کا اور ریل کا بالکل ایک سا حال ہے۔ دونوں ٹرینیں ایک سی کیفیت سے منزلیں طے کر رہی ہیں۔

اُس نے خیال کیا کہ جس طرح ریل کے مسافر ایک حد یا میعاد معیّن تک کا ٹکٹ لیکر سوار ہوتے ہیں اور مقام مقصود پر پہنچکر اُتر جاتے ہیں۔ اسی طرح انسان ایک محدود زندگی خدا کے ہاں سے لیکر اس دنیا میں آتے ہیں اور وقت معینہ پر دنیا سے سدھارتے ہیں۔

جس طرح ٹرین راستہ میں مختلف اسٹیشنوں پہ ٹھہرتی ہے اور بہت سے مسافر وہاں سے اُترتے ہیں بہت سے سوار ہوتے ہیں اسی طرح ہر نئے دن میں جو انسانوں پر گذرتا ہے۔ اور جس کو انسانوں کی زندگانی کا اسٹیشن کہنا چاہیئے بہت سے آدمی مرتے ہیں اور بہت سے نئے پیدا ہوتے ہیں۔

جس طرح مسافر کو راستہ میں بہت سے خطرے پیش آتے ہیں۔ اور ہر وقت اس لئے اُس کو ہوشیاری کرنی پڑتی ہے۔ کہ چور اور رہزن اُس کے مال و متاع کو نہ لیجاویں۔ اسی طرح اپنی زندگی میں ہر عاقل انسان کو اس لئے ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ کہ شیطان وقت بے وقت

اُس کے ایمان کو برباد نہ کر دے +

ریل جس وقت کسی اسٹیشن پر پہنچتی ہے اُس اسٹیشن کے اُترنے والے اپنی گٹھڑی بقچہ سنبھالکر ہوشیاری سے اپنے اپنے ٹکٹوں کو دیکھ لیتے ہیں۔ اسی طرح انسان اپنے آخر وقت میں تائب ہوکر اوروں کی خطائیں بخش کر اور اپنی خطائیں بخشوا کر مرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اور ٹکٹ دیکھ لینے کی جگہ اپنے اپنے مذہبی خیالات کو تازہ کر لیتے ہیں۔ مسلمان کلمہ طیبہ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا اقرار کرتے ہیں +

جس طرح ریل کے مسافر گاڑی کھلتے ہی ٹکٹ دیکر اسٹیشن سے باہر چلے جاتے ہیں اسی طرح وہ انسان جو بہت ہوشیاری سے آخر وقت تک اپنا ایمان سلامت لے جاتے ہیں۔ جب ہی اپنی منزل پوری کر لیتے ہیں فرشتے اُس کا نامۂ اعمال اور احوال دیکھکر اُن کو زندگی کی تکالیف سے آزاد کر دیتے ہیں۔ اور جنت کے دروازے اُن پر کھول دیتے ہیں +

اگر کسی مسافر نے غفلت سے اپنا ٹکٹ کھو دیا تو ریل سے اُترتے ہی پکڑا گیا ریل والوں نے اُس کو چور سمجھ کر گرفتار کیا۔ پھر متعین ہوا اُس کے ساتھ کے مسافر ٹکٹ دیتے جاتے ہیں۔ اور جلدی جلدی اسٹیشن سے باہر چلے جاتے ہیں۔ اور وہ گرفتار بلا سب کو حسرت سے دیکھتا ہے بعض دولتمند بھی آئے جنھوں نے اپنا ٹکٹ گما دیا تھا۔ اُن کو بھی ریل والوں نے روکا سپاہیوں نے اُن کو بھی ذلیل کرنا چاہا لیکن اُنھوں نے کہا کہ ہمارے پاس اور دام موجود ہیں تب سپاہیوں نے اُن سے زیادہ مزاحمت نہ کی اور اُن کو اسٹیشن ماسٹر کے پاس لے گئے آدمی نامی گرامی تھے اسٹیشن ماسٹر نے اُن کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اور اُن کی بڑی سی عزت کی لیکن اس بات پر اُن کو بہت شرمایا کہ آپ سے ایسی غفلت بڑے تعجب کی بات ہے اس قدر تو کرچا کر اور ریل بیگ اور منی بیگ اور پاکٹ بکیں آپ کے ہمراہ تھیں۔ کیا ان میں آپ اپنے ٹکٹ کو محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے اور ٹکٹ کچھ بوجھل بھی نہ تھا۔ آپ اپنی جیب میں بھی اُس کو رکھ سکتے تھے۔ غرض کہ اسٹیشن ماسٹر نے اُن کو بہت ہی شرمایا۔ اور آخر میں فرمایا کہ ابھی آپ میں پوری تہذیب نہیں ہے۔ جب آپ پورے مہذب ہو جاوینگے۔ تو پھر کبھی ایسی غفلت نہ کریں گے۔ مسافروں نے آخر کار اور نقد دام اپنے پاس سے اسٹیشن ماسٹر کو ادا کئے۔ اور تھوڑی مزاحمت کے بعد وہ بھی رخصت ہوئے +

مگر وہ بیچارہ مسافر جس نے ٹکٹ بھی کھو دیا ہے اور اور دام پاس نہیں سخت بیکسی کی حالت میں ہے حسرت سے اپنے ساتھیوں کو آسانی سے چلے جاتے ہوئے دیکھتا ہے اور اپنی خوا ماندر

ذلیل حالت پر آٹھ آٹھ آنسوؤں سے رو رہا ہے بہت ہی کڑوے کڑوے خیالات اُس کے دل پر گذرتے ہیں۔ مگر جیسے ہی اپنے کئے پر پشیمان ہے اور چپ بیٹھا ہوا ہے روپیہ پاس نہیں۔ جو دولتمند غافلوں اور کاہلوں کی طرح وہ بھی رہائی پاتا۔ اُس نے اپنا جبہ ریل والوں کے سامنے پیش کیا کہ اس کو لے لو اور مجھے آزاد کردو لیکن اُس میں ستر بہتر سوراخ تھے کسی نے بھی اُس طرف التفات نہ کیا۔ پھر اُس نے اپنی پھٹی پرانی میلی کچیلی دستار اپنے سر پر سے اتار کر ریل والوں کے قدموں پر ڈالی کہ اس کو قبول کرو اور برائے خدا مجھے چھوڑدو۔ مگر کسی نے یہ بھی نہ جانا کہ کون بکتا ہے۔ اور کیا بکتا ہے۔ آخر اُس نے اپنی جیب ٹٹولی۔ اور اُس میں سے کچھ منصوری پیسے نکالے اور ریل والوں کے سامنے پیش کئے۔ کہ اب اس کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں ہے ریل والوں نے وہ پیسے اُس سے لے لئے مگر وہ بھی رہائی کے لئے مکتفی نہ ہوئے اور آخرکار اسی علت میں وہ مجسٹریٹ کے ہاں سے قید ہوا اور کچھ میعاد تک جیلخانہ کے عذاب اور ذلتیں بھگتنے کے بعد اُس نے اُس رسوائی سے نجات پائی +

یہی حال بجنسہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو اپنی زندگی میں اپنے ایمان کی کچھ حفاظت نہیں کرتے نہ اپنے جیتے جی کچھ ایسے کام کرجاتے ہیں جو آخرت میں اُن کی نجات کا ذریعہ ہوں۔ جب وہ لوگ خالی ہاتھوں اس دنیا سے سدھارتے ہیں تو جاتے ہی پکڑے جاتے ہیں ہر طرف سے پھٹکار ہوتی ہے عذاب کے فرشتے متعین ہوتے ہیں وہ اپنے ساتھیوں کو دیکھتا ہے جو زندگی میں اپنے ایمان کی طرف سے ہوشیار تھے اُن کے نامۂ اعمال طرفۃ العین میں معائنہ ہوتے ہیں اور وہ جنّت میں داخل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پھر بعض ایسے لوگ آتے ہیں۔ جنہوں نے دنیا میں بہت سے عمدہ کام کئے تھے بہت سی نیکیاں اپنے ساتھ لائے تھے اپنی قوم کے لئے ایسے ایسے مدرسے بناگئے تھے۔ جن کی بدولت دین و دنیا میں اُس کو عزت ہو عامہ خلائق کی بھلائی میں انہوں نے عمریں صرف کر دی تھیں۔ مگر ادائے فرائض میں ان سے کچھ قصور ہوگیا تھا۔ اپنی غفلت اور کاہلی سے نماز روزہ کو اچھی طرح ادا نہیں کیا تھا۔ فرشتوں نے اُن کو بھی پکڑا جکڑا اور چاہا کہ ان کو بھی اور گنہگاروں کی طرح ذلیل کریں مگر آواز آئی کہ خبردار یہ میرے خاص بندے ہیں ان کو میرے پاس لاؤ۔ تب فرشتے اُن کو خدا کے پاس لے گئے۔ خدا کی عظمت و جلال دیکھ کر ان انسانوں کا رنگ فق ہوگیا۔ بدن کانپ گیا پاؤں ڈگمگا گئے۔ اور زبان لڑکھڑانے لگی۔ تمام اعضا میں رعشہ سا آگیا تب خدا نے اُن سے ایک پُر رعب آواز کیسا تھ ارشاد کیا کہ بیشک تم نے اپنی زندگی میں اس قدر ذخیرہ اپنی نجات

کا اکٹھا کر لیا ہے۔ مگر وہ آج تمہاری اُن تقصیرات کا جن میں فرشتوں نے تم کو پکڑا کافی معاوضہ ہوگا۔ آج میں اپنا وعدہ ان الحسنات یذھبن السیئات بھی پورا کرونگا اور تم کو تمہاری کوششوں کا پورا صلہ دونگا لیکن مجھ کو تم سے بہت ہی بڑی شکایت ہے تم میرے خاص بندوں میں تھے اور ہمیشہ اس بات کی امید کرتے تھے کہ ایک دن خدا کے سامنے عزت سے حاضر ہونگے تم سے ادائے فرائض میں قصور اور کاہلی ہونا نہایت افسوس کی بات ہے۔ تم میں سے ہر ایک کی کاہلی نے میرے اور بندوں کو بھی کاہلی کی تعلیم دی۔ اور اپنے اس کردار سے میرے بہت سے بندوں کو اپنی بیکار آمد کوششوں میں شریک ہونے اور اپنی عمدہ نصیحتوں پر عمل کرنے سے باز رکھا۔ کیا تم نے یہ جان لیا تھا کہ مجھ کو تمہاری یہ کاہلی کچھ خوش معلوم ہوتی ہوگی۔ کیا تم نے دنیا میں کسی ایسے بادشاہ کا دربار نہ دیکھا تھا یا اُس کے حال سے واقف نہ ہوئے تھے۔ جس نے اپنے درباریوں اور اپنے نوکروں اور اپنی رعایا کے واسطے کوئی ضابطہ بادشاہ کی تعظیم بجا لانیکا مقرر کر دیا ہو کیا تم یہ نہ جانتے تھے۔ کہ اگر کوئی شخص یا کوئی اعلےٰ مرتبہ کا امیر اُس بادشاہ کی تعظیم اُس طریقہ سے بجا نہ لاتا تو اُس بادشاہ کا قہر و غضب کس قدر مشتعل ہوتا کیا امیر اُس بادشاہ کا گو اُس کی ذات سے کیسی کیسی ہی عمدہ عمدہ خدمتیں ظہور میں آئی ہوتی یہ جرأت کر سکتا تھا۔ کہ بغیر حکم بادشاہ کے اپنی کاہلی سے اس کی مقررہ تعظیم میں کچھ قصور کرے پھر کیا تمہارے پاس میرا کوئی فرمان آگیا تھا۔ یا کوئی فرشتہ تمہارے کان میں کہہ گیا تھا۔ کہ تمہارا روزہ نماز تمہاری خوشی پر منحصر ہے یا تم کو اس قدر عقل نہ تھی جو یہ سمجھتے کہ احکم الحاکمین ہماری اس کاہلی سے ناخوش نہ ہوتا ہوگا۔ اگر کوئی عام آدمی ایسی غفلت میں گذارتا تو مجھ کو اُس سے اس قدر شکایت نہ ہوتی اور ایک خفیف سا عذاب اس کو دیکر چھوڑ دیتا۔ لیکن تم میرے برگزیدہ بندوں میں سے تھے تمہاری ان کج ادائیوں سے مجھ کو بہت رنج ہوا ہے۔

پھر خدا نے اُن سے سوال کیا کہ آیا تم کو یہ اُمید تھی یا نہیں کہ خدا کے ہاں ہم عزت سے حاضر ہونگے تب انہوں نے بہت ہی دبی ہوئی اور روتی ہوئی آواز سے جواب دیا کہ ہاں اے باریتعالیٰ ہم کو تیرے رحم اور فضل سے ایسی ہی توقع تھی۔ تیری عنایت سے ہم کو ایسا ہی بھروسہ تھا اور ہم تیری ایسی عنایت کے بھروسہ پر اپنے ارادوں میں اس قدر ثابت قدم رہ سکے۔ پھر خدا نے اُن سے پوچھا کہ کیا تم کو عامہ خلائق اور قومی بھلائی میں ساعی ہونے میں انبیاء کرام سے بھی کچھ زیادہ دعویٰ تھا جواب دیا کہ حاشا ثم حاشا ان کی خاک پا کے برابر بھی کبھی رتبہ نہیں ہوا۔ پھر خدا نے اُن سے پوچھا کہ کیا انبیاء کے صحابیوں سے تمہارا درجہ ان کوششوں کے لحاظ کچھ بڑھا ہوا تھا۔ جواب دیا کہ نہیں ہماری

کیا مجال تھی۔ کہ ہم تیرے اُن مقدس بندوں کی برابری کا دعویٰ کرتے خدا نے فرمایا کہ پھر تمہاری بصارت کی قوت کہاں کھوئی گئی تھی۔ جب ہمارے نبی اور ہمارے انبیاء کے صحابہ۔ باوجود خلائق اور اپنی امت کی اصلاح حال میں اس قدر کوشش بلیغ اور سعی موفورہ کرنے کے کبھی ایک لحظہ کے واسطے بھی ہمارے فرائض کے ادا میں کاہل نہ پائے گئے۔ تیروں اور تلواروں کے طوفان میں بھی انہوں نے نماز روزہ کو نہ چھوڑا سخت سے سخت مصیبت میں بھی وہ ہمیشہ ان فرائض کے ادا میں ثابت قدم رہے۔ تو تم نے کیا سمجھ لیا تھا۔ جو ہمارے خاص اُن فرائض کے بجا لانے میں کوتاہی کی۔ انبیاء اور صحابہ کا اُس قسم کے ادائے فرائض میں ثابت قدم رہنا ہی ایک بڑا ثبوت اس بات کا تھا کہ خدا کے بندوں کو اُس کے بجا لانے میں کاہلی مناسب نہیں۔ علاوہ اس کے میں نے قرآن میں بھی صدہا مقام پر بالتخصیص نماز کی تاکید کی اُس کی خوبیاں بتلائیں اُس کے فائدوں کو جتلایا مگر باایں ہمہ تم نے میرے اُن احکام کی کچھ قدر نہ کی آج تم کس منہ سے اپنے کاموں کا صلہ مجھ سے چاہتے ہو۔ تب یہ گنہگار کچھ جواب نہ دے سکے اور بے اختیار رو دیئے۔ اور اپنے کئے پر بہت ہی پشیمان ہوئے اور بڑی عاجزی اور زاری سے عرض کیا کہ الٰہی ہم کو اپنے کاموں کا کچھ دعویٰ نہیں ہے۔ تو محض اپنے کرم اور فضل سے چاہے ہم کو بخش دے اور چاہے نہ بخش دے بیشک ہم گنہگار ہیں مگر تیری ذات غفور الرحیم ہے اور تیری اس صفت پر جو تیری عین ذات ہے ہمیشہ ہم کو سچا یقین رہا ہے۔ آج اُسی سے ہم کو اپنی نجات کی توقع ہے۔ تب اُس غفور الرحیم نے بڑے جوش میں آکر حکم دیا کہ میں نے تم کو بخشا اور یہ بھی فرمایا کہ تمہاری خدمتیں جو اسلام کے حق میں ہوئیں سب میں نے قبول کی ہیں۔ یہ خدمتیں جن کی تمہاری بدنصیب قوم نے کچھ قدر نہ کی ایسی بڑی عظمت کی ہیں کہ اُن میں سے ہر ایک خدمت تمہاری ایسی ایسی سو کاہلیوں کا تلافی ہو سکتی ہے لیکن شکایت اس بات کی تھی کہ تم میرے خاص بندے تھے تمہارا رتبہ میرے ہاں بہت بڑھا ہوا تھا۔ اس لئے تم کو اپنا کام بہت احتیاط سے کرنا مناسب تھا۔ سچ ہے جن کے رتبے ہیں اُن کو سوا مشکل ہے ؎

جو لوگ اپنے ساتھ بہت سی نیکیاں لائے تھے وہ باوجود اپنی غفلت اور قصور کے بھی اِسی طرح سے خوشی خوشی جنت کو تشریف لے گئے اور پھر وہاں جو جو کچھ اُن کی خاطر و مدارات ہوئی وہ بیان میں نہیں آسکتی۔ مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر ؎

مگر وہ بیچارہ غریب مسافر جو بالکل خالی ہاتھوں آیا مشکیں بندھی ہوئی قیامت کے اُس ہولناک میدان میں دم بخود کھڑا ہے ؎

اے تہی دست رفتہ در بازار
ترسمت باز نا آوری دستار

دنیا میں کوئی ایسا نیک کام نہیں کیا جس کی عوض میں اُس عذاب اور ذلّت سے رہائی ہوتی. مدرستہ العلوم مسلمانان میں خلوص نیت سے کبھی ایک ٹکا نہیں دیا جس کے بدلے نجات ملتی آخر جب وہ بہت گھبرایا تو اپنے دنیا کے اُن کاموں کو اُس نے یاد کیا جن کو وہ نیک جانتا تھا اُس نے فرشتوں سے کہا کہ میں نے دار الحرب سے ہجرت کی اور مکہ معظمہ میں اقامت اختیار کی تھی۔ کیا اس کا کچھ ثواب بھی آج مجھ کو نہ ملیگا۔ فرشتوں نے جواب دیا۔ کہ وہ ہجرت خدا کے واسطے نہ تھی۔ پری رویاں ماہ وش لونڈیوں کے اشتیاق میں ایک وحشیانہ حرکت تھی۔ لوگوں کی نظروں میں اُس بیہودہ کام سے تم نے اپنی عزت پیدا کی لیکن خدا کو تو تمہاری نیت کا حال معلوم ہے +

پھر اُس نے کہا کہ میں نے بیسیوں دفعہ بھنڈارہ کیا اور راہ خدا میں فقیروں کو کھلایا کچھ اُس کا حساب دیکھو۔ فرشتوں نے جواب دیا کہ وہ تمہاری ایک بیجا فضول خرچی تھی اُن تمام بھنڈاروں میں کسی ایک مستحق کو بھی کھانا نہیں پہنچا البتہ ایک کتّے کو تم نے پلاؤ کی بچی ہوئی ہڈیاں ڈالدی تھیں اُس کا کچھ تھوڑا سا ثواب ملا ہے جس سے تمہارے عذاب میں کچھ تخفیف ہوگئی ہے۔ اُس بھنڈارہ میں سب کے سب ایسے لوگ تمہارا مال کھا گئے جنہوں نے بھنگ و بوزہ کے سوا نماز روزہ کی کچھ بھی حقیقت نہیں جانی پھر فرشتے اُس کو ایک اونچے ٹیلہ پر لے گئے وہاں سے اُس نے کچھ لوگوں کو دیکھا جو نہایت ہی سخت عذاب میں مبتلا ہیں یہ شخص اُن کو دیکھکر ڈر گیا۔ فرشتوں نے کہا کہ یہی وہ فقیر ہیں جو تمہارے بھنڈارے میں حاضر تھے راہ خدا میں اگر کچھ دینا تھا تو مدرستہ العلوم مسلمانان کے طالبعلموں کیواسطے کچھ انعام اور وظائف مقرر کئے ہوتے۔ اگر اُس کو بُرا جانتے تھے تو دیوبندھی کے مدرسہ کے طلباء کی خدمت کی ہوتی۔ تم نے تو کچھ بھی نہیں کیا جس کام میں سو آدمیوں نے تمہیں واہ واہ کہی۔ اُسی کو تم نے پسند کیا پھر ثواب کہاں سے ملتا +

پھر اُس بدنصیب نے فرشتوں سے کہا کہ میں نے فلاں فلاں مولوی صاحب اور خواجہ صاحب اور مفتی صاحب اور ملا صاحب وغیرہم کی خدمت کی تھی۔ بہت سا روپیہ ہر سال یہ لوگ میری سرکار میں سے لے جاتے تھے اور وہ سب مجھ سے کہا کرتے تھے کہ یہی دنیا خدا کی راہ کا دینا ہے اُس حساب کو دیکھو اُس میں ضرور تم کو مغالطہ ہوا ہے غالباً اس حساب میں بہت سا ثواب ملیگا۔ فرشتوں نے جواب دیا کہ میاں دیوانہ ہوئے ہو ہم کو بھی تم نے اپنی سرکار کا کوئی محرر سمجھ لیا ہے جو ہم سے غلطی ہو جانیکا گمان کرتے ہو۔ اس حساب

میں بھی خاک تمہارا یا فتنی نہیں ہے سب حساب ہمارا دیکھا بھالا ہے جس وقت تم روپیہ دیتے جاتے تھے ہم اُسی وقت دیکھتے جاتے تھے۔ کیا خدا نے تم کو ان سب لوگوں کا نام بتلا دیا تھا۔ کہ ان کا دینا ثواب ہے۔ یا جو کچھ یہ کہیں وہ سب سچ ہے۔ ان سیہ پیٹ کے پاپیوں نے تم کو دغا دی۔ انہوں نے دین کے پردہ میں دنیا کمائی۔ تمہارے خوش کرنے کے واسطے بہت سے فتوی تمہاری مرضی کے مطابق لکھدیئے جس فتوے کو وہ درحقیقت غلط جانتے تھے اُس پر بھی اُنہوں نے تمہاری خاطر سے مُہریں کر دیں۔ مدرستہ العلوم مسلمانان میں روپیہ دینے کو بُرا بتایا کہ اُن کی روزی میں خلل نہ پڑے اور خود قسمیں کی رقمیں ہضم کر گئے اور کبھی ڈکار تک نہیں لی خواہ ہزاروں روپیہ کے مالک تھے۔ مگر زکوٰۃ کا پیسہ ہمیشہ لیتے رہے میت کے وارثوں کو ہمیشہ اس بات کا یقین دلایا کہ میت کا اسباب ہم سے لوگوں کو دینے سے میت کی روح کو ثواب پہنچے گا کیا ایسے فریبی اور دغا بازوں کا دینا اللہ کی راہ کا دینا ہے واللہ کی راہ میں عالموں کی خدمت کرنی تھی۔ تو مدرستہ العلوم مسلمانان میں مسلمان عالم مدرسوں کی تنخواہوں کے واسطے سرمایہ دیا ہوتا۔ دیوبند اور علیگڈھ ہی کے عربی مدرسے میں کسی مدرس کی تنخواہ کی کفالت کی ہوتی یہ کہکر فرشتے اُس بدنصیب کو پھر ایک اونچے ٹیلے پر لے گئے وہاں سے اُس نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک آتشی گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور خدا کا عذاب اُن پر نازل ہو رہا ہے وہ روپیہ جو انہوں نے دغا اور فریب سے حاصل کیا تھا۔ سانپ اور بچھوؤں کی صورت میں اُن کے بدن سے لپٹا ہوا ہے اور ان موذی جانوروں نے کاٹ کاٹ کر تمام بدن کو چھلنی کر دیا ہے مگر اُن کے ہاتھ کی انگلیوں پر سب سے زیادہ تکلیف ہے وہ زہریلے جانوروں کے ڈنگ کے اثر سے پانی پانی ہو کر بہ جاتی ہیں اور پھر دوبارہ یہی مصیبت برداشت کرنے کے واسطے تازہ جھلی پا کر اپنی اصلی حالت پر آجاتی ہیں۔ یہ شخص اُن کی مصیبت اور عذاب کو دیکھکر ڈر گیا اور خوف کے مارے کانپنے لگا اور کچھ نہ پہچان سکا کہ یہ کون لوگ ہیں، تب فرشتوں نے اُس کو بتلا دیا کہ یہی وہ مولوی صاحب اور خواجہ صاحب اور مفتی صاحب اور ملّاں صاحب ہیں جو دغا دے کر تجھ سے ہر سال رقمیں کی رقمیں لے جاتے تھے اور تجھ کو دھوکا دیکر اس صرف کو خدا کی راہ کا صرف بتلا دیتے تھے اُن کی صورتیں اب مسخ ہو گئی ہیں اس لئے تو ان کو پہچان نہیں سکتا۔ پھر اُس نے پوچھا کہ ان کی انگلیوں پر کیوں ایسا عذاب ہے فرشتوں نے کہا کہ اُنہوں نے بالکل بدنیتی اور تعصب کی راہ سے نہ حقا لطریلا ختلاف رائے کی وجہ سے ان انگلیوں سے مدرستہ العلوم مسلمانان میں نہ چندہ دینے پر مہریں کی تھیں۔ اور اس ذریعہ سے انہوں نے تمام مسلمانوں کو ذلت اور ادبار میں پڑے رہنے کی تدبیر کی تھی۔ اور اُن کی

دینی اور دنیاوی ترقیات میں خارج ہوئے تھے۔ اس لئے خدا نے اُن کی انگلیوں پر زیادہ سخت عذاب نازل کیا ہے۔ پھر اُس بدنصیب نے فرشتوں سے پوچھا۔ اُنہیں لوگوں پر کیا منحصر ہے۔ مدرسۃ العلوم کی نسبت تو اور بھی بہت سے عوام آدمیوں کی رائے مخالف تھی۔ فرشتوں نے جواب دیا کہ وہ بھی انہیں حضرات کے بہکانے سے مخالف تھے علاوہ اس کے ابھی ان لوگوں کا معاملہ تیری آنکھوں کے سامنے گذر چکا ہے۔ جنہوں نے نماز روزہ میں کمی کی تھی اور تو نے دیکھا کہ خدا اُن پر کس قدر غصہ ہوا وہ کیا بات تھی وہ بھی یہی بات تھی کہ وہ لوگ خدا کے خاص بندوں میں تھے۔ اُن سے ایسی حرکت کا ہونا نہایت ناپسندیدہ تھا علیٰ ہذا القیاس یہ لوگ جو عالم اور فقیہہ اور مُلّا اور مفتی اور مجتہد کہلاتے تھے اور انہوں نے علم حاصل کیا تھا دین کی کتابیں پڑھی تھیں ہر طرح کی سمجھ رکھتے تھے ان کا کام یہ تھا کہ لوگوں کو نیک کام پر رغبت دلاتے نہ یہ کہ الٹا انہوں نے اور اُن کو گمراہ کیا اسی لئے خدا نے ان پر سخت عذاب نازل کیا ہے۔ اور نہیں معلوم کہ کب تک اُن پر یہ عذاب قایم رہتا ہے +

تب وہ بدنصیب گنہگار جو خالی ہاتھوں خدا کے ہاں آیا بہت پچھتایا اپنے اور تمام کاموں کو جن پر اُس کو بہت بھروسہ تھا اس طرح اُڑتی ہوئی خاک کی طرح برباد ہوتا ہوا دیکھکر بہت رویا۔ مگر پھر کچھ یاد کر کے اور ہمت باندھکر سنبھل بیٹھا اور ایک زندہ آواز کے ساتھ فرشتوں سے اُس نے کہا کہ میں نے اپنے جیتے جی بہت سی مسجدیں راہِ خدا میں تعمیر کرائی ہیں۔ اُن کا حساب کہاں ہے۔ جن زمینوں پر میں نے مسجدیں بنوائیں وہ مجھ کو کچھ بہکانے نہیں آئی تھیں جو اینٹیں اور مصالح میں نے اُن مقدّس اور پاک عمارتوں میں صرف کیا تھا۔ اُس بے زبان نے کچھ اس کام کے واسطے میری خوشامد نہ کی تھی۔ یہ کام میرا اس طرح اکارت ہوگا۔ فرشتوں نے وہ سب حساب اُس کو دکھلایا۔ جن مسجدوں میں ہزار ہا روپیہ صرف ہوا تھا۔ اور جن پر اُس کمبخت کو بہت ناز تھا وہ بالکل راہ خدا کے حساب میں سے خارج کر دی گئیں تھیں۔ اُن میں سے کسی کی نسبت تو یہ لکھا ہوا تھا۔ کہ گاؤں کے ٹھاکروں سے بیدخلی کاشت پر تنازع ہوا تھا اُن کو رنج دینے کے واسطے یہ مسجد اُن کے مندر کے پاس بنائی گئی ہے۔ ہم سے اس مسجد سے کچھ واسطہ نہیں اور کسی کی نسبت حساب میں یہ یادداشت تحریر تھی کہ اس پر ایک بڑا کتبہ قائم کیا گیا تھا جس پر اس کے بنانیوالے نے اپنے آپ کو حاتم دوران اور حامیٔ دین و ایمان لکھوایا تھا۔ اور اُس سے یہ غرض تھی۔ کہ میرا نام نیک اس کے ذریعہ سے دنیا میں قایم رہے چنانچہ جبتک وہ مسجدیں برقرار رہیں اُس کا وہ مقصد دنیا میں حاصل ہا ہمارے حساب سے

اُس کو کچھ سرکار نہیں ہے البتہ چند چھوٹی چھوٹی مسجدوں اور بعض پرانی مسجدوں کی مرمتوں کو راہ خدا کے حساب میں شامل کیا گیا تھا اور اُن کا ثواب بھی جاری تھا۔ فرشتوں نے اُس بدنصیب سے کہا کہ صبح اور شام ایک ایک جام ٹھنڈے پانی کا جو تجھ کو ملجاتا ہے وہ اسی ثواب کی وجہ سے ہے یہ سُنکر وہ بدنصیب پھر رونے لگا اور اپنی زندگی کی حالت پر بہت افسوس کیا مگر تھوڑی سی مزا کے بعد اُس نے بھی اُس مفلس مسافر کی طرح جس کو اپنا ٹکٹ گمانے کی بدولت کچھ روزوں جیلخانہ میں رہنا پڑا عذاب سے رہائی پائی +

پھر جس طرح ریل کی ٹرین میں گاڑیاں مختلف درجہ کی ہوتی ہیں۔ کوئی شاہی گارڈی ہے اور کوئی امراء شاہی کی۔ کوئی اوّل درجہ کی کوئی دوم درجہ کی کوئی درمیانی درجہ ہے۔ اور کوئی سب سے آخر کا درجہ۔ اسی طرح انسانوں کی زندگی کی ٹرین کا حال ہے وہ بھی مختلف درجوں میں منقسم ہے شاہی گاڑیوں سے انبیاء صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین کی زندگی مراد ہے جنہوں نے اپنی تمام عمریں اپنی امت کی اصلاح حال میں صرف کیں۔ اُن سے گالیاں سُنیں۔ پتھر کھائے۔ مگر ہمیشہ اُن کو دعائے خیر سے یاد کیا۔ اور بڑے استقلال مگر ملائمت اور ترحم کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے +

اس کے بعد امراء شاہی کی گاڑیوں کے مقابلہ میں نبیوں کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی ہے جو بالکل انبیاء کے قدم بقدم چلے اور جن کاموں کی بنیاد اُن کے نبی ڈال گئے اُس کو انہوں نے ویسے ہی استقلال اور تحمل کے ساتھ پورا کیا +

ریل کے اوّل درجہ کی گاڑیوں کی مناسبت میں اُن عالی رتبہ لوگوں کی زندگی ہے جنہوں نے عام مخلوق اور اپنی قوم کی بھلائی میں اپنا وقت اپنا آرام اپنا مال صرف کیا اور کرتے ہیں جن کی بھلائی چاہتے ہیں وہی بُرائی پہنچانے پر مستعد ہیں جن کے ساتھ دوستی کرتے ہیں وہی شخص دشمنی سے پیش آتے ہیں جن پر اپنی جان قربان کرتے ہیں وہی گلے کا ہار ہوتے ہیں جن کی حمایت کرتے ہیں وہی مخالفت پر کمر کستے ہیں۔ جن کے اسلام کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں وہی کفر کے فتوے سُناتے ہیں۔ اور یہ خدا کے شیر اپنی قوم سے بُرا بھلا سُنتے ہیں اور خوش ہیں۔ کفر کے فتوے سنتے ہیں۔ اور پھُولے نہیں سماتے قوم کی پست ہمتیاں اور نالائقیاں دیکھتے ہیں مگر ہمت نہیں ہارتے میرے نزدیک اسی درجہ انسانوں کو وارث انبیاء کہنا صحیح ہے فلسفہ اور منطق اور ریاضیات اور ادب وغیرہ میں لاجواب ہونے اور صاحب جبّہ و دستار بنجانے سے انبیاء کا ورثہ نہیں مل سکتا۔ فر ہی

چیزے دیگرہ آماس چیزے دیگرست +

ریل کے دوم درجہ کی گاڑیوں کے مقابلہ میں فی زمانناً اُن لوگوں کی زندگی ہے جو اول درجہ کے لوگوں کی مدد کر رہے ہیں اور اُن کے ارادوں کی تکمیل میں ساعی ہیں ایسے لوگوں کا وجود بھی بہت ہی غنیمت ہے۔ بڑی خوشی کی بات تو یہ ہے۔ کہ اس درجہ کے لوگ ایسی ترقی کریں جو اس ٹرین میں بہت سی اوّل درجہ کی گاڑیاں اُن کے واسطے زاید لگانی پڑیں ورنہ کم سے کم اس قدر کوشش اُن کو ضرور کرنا چاہیئے۔ کہ اگر وہ پہلے درجہ کے لوگ جن کی عمر خدا دراز کرے اور اُن کو ابھی مدّت تک صحیح و تندرست رکھے۔ جس وقت اپنی منزل پوری کر کے اپنی گاڑی میں سے اُتریں۔ اور اندل کے اسٹیشن ماسٹر کو اپنا ٹکٹ حوالہ کریں۔ تو یہ دوسرے درجہ کے لوگ اُن کے جانشین ہو جاویں اور اُس ٹرین کی اُن معزز گاڑیوں کو خالی نہ چھوڑیں +

درمیانی درجہ تھوڑے روزوں سے ریل کی ٹرین میں شامل ہوا ہے یہ اُن لوگوں کی زندگی کے ٹھیک ٹھیک مناسب ہے جو کچھ تھوڑے روزوں سے زمانہ کے حالات پر غور کرنے لگے ہیں۔ اور اپنے آپ کو پست حالت سے نکالنے کی فکر میں ہیں لیکن بے استطاعتی یا کم ہمتی سے ابھی اوپر کی معزز گاڑیوں میں جانے سے جھجکتے ہیں۔ مگر اُمید ہے کہ وہ سب اعلےٰ درجہ میں رفتہ رفتہ ترقی کرینگے +

سب سے اخیر درجہ ریل کا جو اب تیسرا درجہ کہلاتا ہے اُن عام انسانوں کی زندگی ہے۔ جن کی اصلاح اور ترقی میں معزز گاڑیوں والے کوشش کر رہے ہیں اور تھوڑے بہت فاصلہ سے اُن کے ساتھ ساتھ اس ٹرین میں اپنی زندگانی طے کر رہے ہیں ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ اس ذلیل درجہ میں سے سب لوگوں کو نکالکر معزز درجہ کی مختلف گاڑیوں میں سوار کر دیں لیکن مجبوری یہ ہے کہ خود اس قدر مقدور نہیں رکھتے جو سب کے لئے اعلےٰ درجہ کا ٹکٹ لے دیویں اور اس ذلیل درجہ کے بیٹھنے والے صرف ہمت نہیں کرتے +

غرض کہ جہاں تک غور کیجئے ریل کی ٹرین اور انسانوں کی زندگی بہت سے حالات کے لحاظ سے یکساں طریقہ سے چل رہی ہے یہاں تک کہ ہم درحقیقت کسی ملک کی ریل کی ٹرین کو دیکھکر یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ اس ملک کے انسانوں کی زندگی کس طرح پر بسر ہوتی ہے ہمارے ملک کی ٹرین میں سب سے پست درجہ میں مسافروں کی بہت کثرت ہوتی ہے جس کا نتیجہ ملک کی حالت کے ٹھیک ٹھیک مناسب ہے یعنی سب تباہی اور ذلّت میں مبتلا ہیں۔ معزز درجہ کی گاڑیوں میں بیگانہ ملکوں کے کالی کرتی والوں کے سوا اس ملک کے سفید پوش بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ ہمارے ان تمام علی غول میں

بہت کم ایسے ہیں جو درحقیقت اصلی عزت کے مستحق ہیں +

اب میں اپنے مسلمان بھائیوں سے بہ منت عرض کرتا ہوں کہ وہ اس خراب اور ذلیل حالت سے بالاتر درجوں میں ترقی کرنیکی فکر کریں اور جو لوگ اس عمدہ کام میں اُن کی دستگیری کر رہے ہیں اُن کی نصیحتوں کو تمام تر شکر گذاری کے ساتھ سنیں اور اُن پر عمل کریں۔ والسّلام +

تہذیب و شائستگی

اصل شائستگی خیال کی شائستگی ہے

ہمارے اس زمانہ میں شائستگی اور تہذیب پر بہت بحث ہو رہی ہے اور مسلمانوں میں اُس کی نسبت ایک گرم مباحثہ قائم ہے اور لوگوں کی مختلف رائیں ہو رہی ہیں کوئی طرز لباس کو شائستگی پر بہت کچھ مُوثر سمجھتا ہے اور کوئی کھانا کھانے کے طریقوں کی تبدیلی کرنا چاہتا ہے کسی کو ایک بات مہذب اور شائستہ معلوم ہوتی ہے دوسرا اُسی کو نامہذب اور ناشائستہ ٹھہراتا ہے کوئی اپنی گھیتلی جوتی اور جبّہ و دستار میں خوش ہے کہ شائستگی یہ ہی ہیں شاید کوئی انگریزی بوٹ چڑھائے اپنے کوٹ و پتلون پر غش ہے کہ تہذیب ہمیں یک معنی دار دیگر میری دانست میں یہ سب قصّے اور بکھیڑے ہیں اور اصل شائستگی خیال کی شائستگی ہے +

تہذیب و شائستگی کا عمدہ اور اعلےٰ منشا یہ ہے کہ انسان اس طرح پر اپنی زندگی بسر کرے جس سے اپنی ذات بھی ہمیشہ آرام اور خوشی اور تندرستی کے ساتھ رہے اور دوسروں کو بھی اُس سے فایدہ پہنچے اور ایسے وسیلے بہم پہنچائے جاویں جن سے ہر قسم کی مشکلات پر غالب آنا سہل اور ہر قسم کی خوشی اور راحت حاصل ہونا آسان ہو جاوے پس جس انسان کے دماغ میں ایسی قوت ہو کہ وہ ان تمام باتوں پر قادر ہو سکے اسی کو ہم شائستہ کہہ سکتے ہیں اور اسی کا نام خیال کی شائستگی ہے باقی وہ امور جو طرز معاشرت اور طریق تمدّن سے علاقہ رکھتے ہیں وہ انسان کی بسر زندگانی کے لیے ایسے خارجی اسباب ہیں جن پر ایک شائستہ اور مہذب آدمی ملک کے مختلف موسموں اور آب وہوا وغیرہ کے لحاظ سے اسبات پر غور کر سکتا ہے کہ ان امور میں سے کس امر سے مجھ کو آرام ملیگا۔ اور کس سے بخوبی تندرست رہ سکتا ہوں۔ اور کونسی چیز میری خوشی کو بڑھا سکتی ہے اور میرا کونسا کام دوسروں کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ اور یہ جو رائے قائم ہو۔ اُس پر ہر عاقل انسان کو عمل کرنا ضرور ہے لیکن خیال کی شائستگی

اور درستی سے پہلے اُن اُمور میں سے کسی تقلید اً اختیار کرنا اور کسی کو ترک کرنا انسان کو شائستہ نہیں بنا سکتا ٭

جس آدمی کا خیال شائستہ ہے اُسکے تمام کام خود بخود ایسی عمدہ ترتیب سے انجام پاتے ہیں جس سے وہ تمام خوشیاں اور آرام جو تہذیب و شائستگی کا نتیجہ ہیں بالضرور حاصل ہوں۔ نامہذب آدمی کے تمام کام ہمیشہ بے ترتیب ہوتے ہیں جن سے زندگی اور تلخ ہو۔ مہذب آدمی کی مثال بالکل انسان کی تندرستی کی سی ہے۔ جب تک انسان تندرست ہوتا ہے اسکے تمام اعضا اپنے اپنے موقع سے وہ تمام کام خود بخود کرتے رہتے ہیں جو انسان کی راحت اور خوشی بڑھانے کا ذریعہ ہوں اور رنجوں اور تکلیفوں کو دور کریں۔ جن آدمیوں کا خیال شائستہ نہیں ہوا ہے اور وہ کسی شائستہ اور مہذب قوم کی چند رسموں اور دستوروں کی تقلید ہی کو شائستگی سمجھتے ہیں اُن کی مثال بالکل ایک ایسے مریض کی سی ہے جو تندرستوں کی سی حرکتیں کرنا چاہتا ہو۔ مگر کسی طرح اُس مریض کی یہ حرکتیں ایک تندرست آدمی کے کاموں کے برابر نہیں ہو سکتیں اسی طرح جن لوگوں کے ابھی خیال شائستہ نہیں ہوئے اُن کے بعض تقلیدی طریقے اُن کو مہذب اور شائستہ نہیں کر سکتے ٭

پس مسلمانوں کو لازم ہے کہ سب سے پہلے اپنے خیالات کو عمدہ کریں اور اگر اُن کے خیال عمدہ ہو گئے تو سب قسم کی ترقیاں خود بخود اُن میں ہو جاویں گی۔ ورنہ تقلیدی شائستگی سے کچھ کام نہیں چل سکتا کبھی ایسی ٹہنی سے پھولوں کے کھلنے کی توقع نہیں ہو سکتی جس کا سلسلہ ایک مستحکم جڑ تک نہیں پہنچتا گو دیکھنے والوں کی نظروں میں وہ کیسی ہی سرسبز اور شاداب معلوم ہوتی ہو ٭

اور خیالات اُس وقت تک عمدہ نہیں ہو سکتے۔ جبتک دوسروں کے خیال سے معاوضہ نہ کیا جاوے جس طرح مال و دولت پھیر بدل سے بڑھتا ہے اسی طرح خیال کی بھی ترقی ہوتی ہے جب آدمی تعصب کو چھوڑ کر دوسروں کی رائے اور دوسروں کے خیال پر غور کرتا ہے اور اپنے خیالات سے دوسروں کو مطلع کرتا ہے اور پھر دونوں رایوں اور دونوں خیالوں کا باہم مقابلہ ہوتا ہے اور ایک خیال صحیح اور دوسرا خیال غلط یا ایک کامل اور دوسرا لائق اصلاح معلوم ہونے لگتا ہے تب رفتہ رفتہ انسان کا خیال ترقی کرنے لگتا ہے۔ اور جب یہ ترقی کامل ہو جاتی ہے۔ تو انسان مہذب اور شائستہ کہلانے کا مستحق ہوتا ہے ٭

انسان کے خیال کی ترقی بالکل اس طرح سے ہوتی ہے جس طرح کوئی شخص درجہ بدرجہ سیڑھیوں پر چڑھتا ہے اور کسی بلند زینہ کو طے کرتا ہے فرق صرف یہ ہے کہ زینہ کو طے کرنے وقت انسان خود بھی دیکھتا ہے کہ کس قدر دوری میں طے کر چکا ہوں اور کس قدر دوری ابھی باقی ہے۔

خیال کی ترقی میں انسان کو خود اچھی طرح معلوم نہیں ہوتا۔ کہ میں نے کس قدر ترقی کی لیکن اور دیکھنے والوں کو معلوم ہو جاتا ہے +

انسان ایک وقت میں ایک عمدہ اور نہایت عمدہ کام کو اس قدر برا جانتا ہے اور اپنے نزدیک اُس کی برائی کا ایسا قطعی فیصلہ کر لیتا ہے کہ اُس رائے کے برخلاف تذکرہ کرنا بھی فضول سمجھتا ہے خیال کی یہ حالت اُس وقت ہوتی ہے جب تک وہ ترقی کے زینہ پر قدم نہیں رکھتا +

مگر جب ایسی گفتگوئیں اُس کے سامنے برابر جاری رہتی ہیں تو یہ شخص اُن کو سُن سُن کر پیچ و تاب کھاتا ہے اور اپنی مخالف رایوں کو رد کرنے لگتا ہے بہت سے دلائل اپنے خیال کی تائید میں پیدا کرتا ہے۔ اور بڑی جد و جہد سے اپنی مخالف رایوں کے جواب دینے کی فکر میں پڑ جاتا ہے۔ یہ حالت خیال کی ترقی کی پہلی سیڑھی ہے +

جب کوئی آدمی اس سیڑھی پر چڑھ گیا ہے تو اب وہ ایک ایسے مباحثہ میں پڑا جہاں بالضرورت موافق اور مخالف رائیں اُس کو دیکھنی پڑتی ہیں کچھ عرصہ تک وہ پہلی ہی سیڑھی پر قدم مضبوط گاڑے ہوئے کھڑا رہتا ہے مگر آخر کار اُس کا خیال اس بات پر غور کرنے لگتا ہے کہ ان دونوں رایوں میں سے کون سی صحیح ہے اور کون سی غلط۔ یہ حالت خیال کی ترقی کی دوسری سیڑھی ہے +

سچائی کا یہ ذاتی وصف ہے کہ اگر انسان اُس پر بغیر کسی تعصب کے غور کرتا ہے تو بیشک اُس کو سچائی کا اقرار کرنا پڑتا ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ اگرچہ سخت سے سخت تعصب کے ساتھ بھی کسی بات پر برابر غور اور مباحثہ جاری رہے تو بھی ایک نہ ایک دن سچائی غالب ہو رہیگی مگر بہت دیر کے بعد پس جن رایوں پر انسان دوسری سیڑھی پر کھڑا ہوا غور کرتا ہے اگر اُن میں سے وہ رائے جس کو وہ پہلے بُرا جانتا تھا در حقیقت سچ ہوتی ہے تو بلاشبہ انسان اُس کو اپنی استعداد کے موافق خواہ جلد خواہ بدیر قبول کر لیتا ہے اور یہاں وہ انما یستجیب الذین یسمعون کا مصداق بنتا ہے یعنی بات کو قبول وہی کرتے ہیں جو سنتے ہیں۔ یہ حالت خیال کی ترقی کی تیسری سیڑھی ہے +

اس سیڑھی پر پہنچکر آدمی اُس رائے کو جس کے برخلاف ایک دن گفتگو تک کرنا فضول خیال کرتا تھا غلط سمجھنے لگتا ہے اور کچھ مدت تک وہ اسی تیسری سیڑھی پر کھڑا رہتا ہے وہ اوروں کو چوتھی سیڑھی پر چڑھتے ہوئے دیکھتا ہے مگر خود ارادہ نہیں کرتا وہ اپنے ساتھیوں کو ایک کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے جس کو وہ صحیح تسلیم کر چکا ہے۔ مگر اس پر عمل کرنے کو وہ اچھا نہیں جانتا۔ وہ اہل کتاب کے ساتھ مواکلت کو اب برا نہیں جانتا اُس کو مستحق عذاب الٰہی نہیں سمجھتا۔ اور آخر کار اُس کی منفعتوں کا بھی اقرار کرنے

لگتا ہے۔ مگر نہ آپ اُسکے کرنیکی جرأت رکھتا ہے نہ دوسروں کے اس عمل کو پسند کرتا ہے مگر کچھ دنوں کے بعد وہ چوتھی سیڑھی پر چڑھتا ہے یہاں بھی اُس کام کو اختیار نہیں کرتا جس کو خود اچھا جان چکا ہے۔ مگر اتنا فرق ہو جاتا ہے کہ یہاں پہنچکر وہ دوسروں کو بھی اُس کام کی وجہ سے بُرا نہیں سمجھتا۔ اُن کو ملامت کرنا چھوڑ دیتا ہے جو حقارت اور نفرت اُس کے دل میں اُس کام کے اختیار کرنے کے سبب سے اوروں کی طرف سے ہوتی ہے وہ اب باقی نہیں رہتی۔ ہمارے بعض دوستوں کا قول ہے کہ جن لوگوں کے خیال کی ترقی اس چوتھے درجہ تک ہو جاتی ہے وہ تہذیب و شائستگی کی یونیورسٹی یا دار العلوم میں داخلہ کا امتحان پاس کرتے ہیں +

اس کے بعد جب آدمی دوسروں کو وہ کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے جس کا مفید ہونا اس کو تسلیم ہے اور وہ فعل اس کو ناگوار بھی نہیں معلوم ہوتا تو تھوڑی دیر دم لیکر اب وہ پانچویں سیڑھی پر آتا ہے یہاں وہ اس تردد میں پڑتا ہے کہ میں بھی اس کام کو کروں یا نہ کروں۔ دوسروں کو مفید مفید کام کرتے ہوئے دیکھکر جی بہت للچاتا ہے مگر جرأت نہیں پڑتی۔ عقل بالکل آگے چلنے کی رغبت دلاتی ہے مگر مصلحت[1] دامن نہیں چھوڑتی۔ اس پانچویں سیڑھی پر بڑی بےچینی سی گذرتی ہے صبح کو ارادہ ہوتا ہے کہ آج تو مسلمان ہو ہی جائیے مگر شام پھر ویسی ہی تاریک آتی ہے جیسی گذری ہوئی شام کو یہ قصّہ ہوتا ہے کہ کل ہر چہ بادا باد۔ مگر صبح کو آفتاب کا قہرناک چہرہ پھر ویسی ہی ہیبت طاری کر دیتا ہے +

لیکن آخر کار ہمت مرداں مدد خدا ایک دن یہ مشکل مقام بھی طے ہو جاتا ہے اور خدا کا نام لیکر آدمی اُن کاموں کو خود کرنے لگتا ہے جن کو وہ ایک دن نادانی اور ناسمجھی سے بُرا سمجھتا تھا اور اب بہت سے مباحثوں اور گفتگوؤں اور غور و تامل کے بعد اُن کو نہ صرف برائی سے بری خیال کرتا ہے بلکہ اُن کے مفید اور نہایت مفید ہونے پر کامل یقین کر لیتا ہے یہ حالت انسان کے خیال کی چھٹی سیڑھی ہے +

اس سیڑھی پر قدم رکھتے ہی آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ زینہ ختم ہو گیا اور اب وہ ایک ایسے بلند اور خوش فضا سطح پر پہنچ جاتا ہے جس کی خوبیاں بیان سے باہر ہیں اور ہر ایک سیڑھی پر جتنی جتنی دیر ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تھا اُس پر افسوس کرتا ہے اب وہ دیکھتا ہے۔ کہ اُس نہایت ہی دلکش میدان میں جابجا صاف اور شیریں چشمے اور نہریں جاری ہیں۔ سبزہ نے تمام میدان پر فرش زمرّدین بچھا دیا ہے۔ مختلف قسم کے پھول اور پودے اور درخت جدا لطف دکھلا رہے ہیں۔ مرغان خوش الحان اپنی اپنی بولیوں

---

[1] یہ ایک ہنسی ہے اُن لوگوں کی جو کسی کام کی خوبی کو عقلاً تسلیم کرتے ہیں مگر مصلحت کا عذر کرتے ہیں حالانکہ عقل اور مصلحت بالکل ایک ہے +

میں اپنے پروردگار کی یاد میں مصروف ہیں۔ وہاں اگر کوئی ناہموار مقام بھی ہے تو نہایت ہی دلچسپ دکھلائی دیتا ہے اور وسط میں ایک چشمہ کے کنارہ پر نہایت خوبصورت ایک مینار ہے اور اسپر موٹے موٹے طلائی حرفوں میں عربی خط سے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے*

دنیا میں خدا کی یہ رحمت خاص اُن مسلمانوں کے واسطے ہے جو چھوئں سیڑھیاں طے کرکے

یہاں تک پہنچ جاویں*

میں نے ایک مقابل کے اونچے ٹیلے پر چڑھکر اس تمام کیفیت کو دیکھا میں نے دیکھا کہ اُس گلستان ہمیشہ بہار میں جابجا نہایت ہی قرینہ کے ساتھ بہت ہی پرتکلف بہت سے تخت اور آرام چوکیاں بچھی ہوئی ہیں۔ بہت سے لوگ مجھ کو اُن تختوں اور آرام چوکیوں پر بیٹھے ہوئے معلوم ہوئے لیکن نہ میں اُن لوگوں کی صورت پہچان سکا نہ اُن کی بولی کچھ میری سمجھ میں آئی۔ عقل سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ لوگ مصر اور قسطنطنیہ اور ٹونس وغیرہ کی طرف کے مسلمان ہیں جو ان چھئوں سیڑھیوں کو طے کر چکے ہیں اور اب خدا کی رحمت کے مزے لوٹ رہے ہیں*

میں اُن بہت سے شخصوں میں سے صرف دو شخصوں کو پہچان سکا جن کے تخت میدان کے کنارہ پر اُس مقام پر بچھے ہوئے تھے۔ جہاں وہ زینہ ختم ہوتا ہے ایک تخت پر میں نے سید احمد خاں کو دیکھا۔ کہ تہذیب الاخلاق کی بہت سی نفیس نفیس اور سنہری جلدیں اُن کے سامنے رکھی ہوئی ہیں اُن میں سے وہ کسی کسی جلد کو اٹھا کر کوئی کوئی مضمون ہندوستان کے مسلمانوں کو سنا رہے ہیں اور جس عمدہ مقام پر وہ خود موجود ہیں اور جس کی خوبیاں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اُس کو بڑی دلسوزی اور محبت کے ساتھ اُن لوگوں کو سمجھاتے ہیں جو اس زینہ کے نیچے گروہ در گروہ نہایت بے ترتیبی اور بے سروسامانی کی حالت میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں اور زبان حال سے یہ کہتے جاتے ہیں۔ یا لیت قومی یعلمون*

میں نے اُس ٹیلہ پر سے دیکھا کہ کوئی مسلمان جسکے کان میں سید احمد خاں کی آواز پہنچی ایسا باقی نہ رہا تھا جس نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی ہو میں نے دیکھا کہ تمام مسلمان پہلی آواز پر اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس خیال کی ترقی کے زینہ کی طرف کو دوڑے اور جیسی جس کی استعداد اور قوت تھی ویسی ہی اُس نے ترقی کی بعض ضعیف الجثہ اور کم ہمت یا نابینا اور لولے لنگڑے ابھی پہلی سیڑھی تک بھی نہیں پہنچے ہیں۔ باقیوں میں کوئی پہلی سیڑھی پر ہے کوئی دوسری سیڑھی پر کسی نے تیسری سیڑھی تک ترقی کرلی ہے۔ اور کوئی چوتھی سیڑھی پر پہنچ گیا ہے اور بعض جو بہت ہی عقلمند اور ذکی اور حسیت و

چالاک تھے وہ پانچویں سیڑھی تک بھی پہنچ گئے ہیں۔ جو لوگ پانچویں سیڑھی پر پہنچ گئے ہیں۔ اُن کو سید احمد خاں ہاتھ بڑھا کر اپنی برابر اوپر لے لیتے ہیں۔ چنانچہ میرے دیکھتے دیکھتے انہوں نے پانچویں سیڑھی پر سے ایک شخص کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کو کھینچ لیا وہ بھی اُس پُر فضا میدان کی راحتوں اور خوشیوں کا لطف حاصل کرنے لگا۔ اور سید احمد خاں کی برابر اپنی آرام چوکی سے ہاتھ لگا کر کھڑا ہو گیا میں نے جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ مولوی سید مہدی علی صاحب ہیں۔ جو اپنی چستی اور رسائی عقل سے نہایت جلد چھٹوں سیڑھیاں طے کر گئے اُن کو میں اس عمدہ مقام میں پہنچا ہوا دیکھکر بہت ہی خوش ہوا۔ مولوی سید مہدی علی صاحب نے بھی ایک جلد سید احمد خاں کے سامنے سے اٹھالی اور انہوں نے بھی اس کے مضامین باواز بلند اُن لوگوں کو سنانے شروع کئے جو یا زینہ طے کر رہے تھے یا زینہ کے نیچے اُس پر چڑھنے کی فکر میں کھڑے ہوئے تھے ✦

مَیں نے ایک اَور مولوی صاحب کو بھی دیکھا جو چوتھی سیڑھی سے پانچویں سیڑھی پر چڑھنے کی تیاری کر رہے تھے اور عنقریب پانچویں سیڑھی پر پہنچنا چاہتے تھے۔ مگر انہوں نے مجھے دور سے اشارہ سے منع کیا کہ میرا نام ابھی کسی سے نہ لینا انہوں نے بھی سید احمد خاں کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دی اور جو بات وہ سید احمد خاں سے قریب ہونے کی وجہ سے اچھی طرح سنتے اور سمجھتے تھے۔ اُس کو نیچی سیڑھیوں والوں کو سمجھانے لگے ✦

پہلی اور دوسری سیڑھیوں والوں کی کیفیت دیکھکر مجھ کو بے اختیار ہنسی آئی میں نے دیکھا کہ وہ سید احمد خاں کی آواز سنتے ہی دوڑے اور کوئی پہلی اور کوئی دوسری سیڑھی اُس زینہ کی طے کر گیا۔ گویا سید احمد خاں کے منشاء کی پوری تعمیل میں مصروف ہیں لیکن باایںہمہ وہ سید احمد خاں سے مخاطب ہو کر زبان درازیاں کرتے جاتے ہیں۔ اُن میں سے کوئی کہتا ہے کہ سید احمد خاں کی ایک مت سنو کوئی کہتا ہے کہ بالکل اُس کے برخلاف کام کرو یہ کہتے جاتے ہیں اور اوپر کو چڑھتے جاتے ہیں۔ سید احمد خاں بھی اُن کی اس حالت کو دیکھکر مسکرا پڑے اور کہنے لگے کہ کیسے پاگل آدمی ہیں جس کام کو کرتے جاتے ہیں۔ اُسی کو بُرا کہتے ہیں۔ جس راستہ کو بند کرتے ہیں اُسی طرف کو چلتے جاتے ہیں۔ مگر تا بہ کے تین سیڑھیاں اُن کو بھی طے کرنا باقی ہیں۔ سمجھدار ہوتے جلد طے کر لیتے نادان ہیں بدیر طے کریں گے ✦

یہ مزے مزے کی باتیں دیکھکر میں اُس ٹیلہ پر سے اُتر آیا اور اُس وقت سمجھا کہ سیّد احمد خاں کے تہذیب الاخلاق نے ہندوستان کے مسلمانوں میں کیا اثر پیدا کیا ہے اور آیندہ

کیا اثر پیدا کرے گا ٭

مدرسۃ العلوم مسلمانان

اور

جناب حاجی مولوی سید علی بخش خاں صاحب بہادر

اور

جناب مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر

چند روز ہوئے جو جناب حاجی مولوی علی بخش خاں صاحب بہادر نے اخباروں میں یہ مشتہر فرمایا ہے کہ مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر نے اُنکے ساتھ وعدہ خلافی کی اور جن شرطوں پر جناب ممدوح نے مدرسۃ العلوم میں آٹھ سو روپیہ چندہ دینے کا وعدہ فرمایا تھا کمیٹی خزنۃ البضاعۃ نے اپنا جلاس ۵ اگست ۱۸۷۴ء میں اُن کے برخلاف کارروائی کی اسلئے جناب ممدوح اب نہ مدرسۃ العلوم میں شریک ہونگے اور نہ چندہ مشروطہ دینگے ٭

میں نے جناب ممدوح کی تحریر کو اول سے آخر تک دیکھا میری دلی تمنا یہ تھی کہ میں اس تحریر کے چھپنے سے پہلے نجی کے طور پر جناب ممدوح کی خدمت میں کچھ عرض کرتا اور اگرچہ جناب ممدوح نے مجھ کو اس بات کا موقع بھی دیا لیکن افسوس ہے کہ مجھ کو اپنے عہدہ کے کاموں سے اُس عرصہ میں مطلق فرصت نہ ملی اور یہ تحریر جناب ممدوح نے مشتہر فرمادی میں نے پہلے یہ سنا تھا کہ جناب موصوف کو بعض امور کی نسبت کچھ شکایت ہے لیکن میں یہ نہ سمجھا تھا کہ اپنی لمبی شکایت ہوگی یا وہ سید احمد خاں صاحب اور کمیٹی خزنۃ البضاعۃ پر اس قدر سخت الزام عاید کرینگے۔ جیسا اُن کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال اب میں نے اُن کی تحریر کو اوّل سے آخر تک دیکھا۔ اُن کی تمام تر تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ سید احمد خاں صاحب سے اُن سے دو شرطیں کی تھیں اور اُنہوں شرطوں پر جناب موصوف نے آٹھ سو روپیہ چندہ لکھا تھا۔ پہلی شرط یہ تھی کہ سید احمد خاں صاحب اور اُن کی کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کا کوئی ممبر تعلیم مذہبی میں مداخلت نہ کرے بلکہ مذہبی تعلیم کی کمیٹی جُدا قایم ہو اور اُس میں اور ایسے لوگ شریک کئے جاویں جن پر عام مسلمانوں کو اطمینان و اعتماد ہو اور سید احمد خاں اور ممبران

موجودہ کمیٹی خزنتہ البضاعۃ کبھی اس مذہبی کمیٹی میں شریک نہ ہو سکیں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ اس مذہبی کمیٹی کے ممبروں کی تعداد اور اُن کا انتخاب اور اُس کمیٹی کی کل سربراہی بہ سبب کچھ جناب حاجی صاحب موصوف کے بقدرت میں رہے جس کو وہ اپنے نزدیک مسلمان اور لایق اعتماد سمجھیں اُس کو شریک کریں جن پر اُن کو اطمینان نہ ہو اُن کو شریک نہ کریں +

پھر جناب ممدوح رقم فرماتے ہیں کہ کمیٹی خزنتہ البضاعۃ نے بالکل ان شرطوں کے برخلاف کاروائی کی۔ نہ تو مذہبی کمیٹی کے ممبروں کا مقرر کرنا اور اُن کا منتخب کرنا جناب مولانا صاحب کے اختیار میں چھوڑا گیا اور جو مذہبی کمیٹی قایم ہونی تجویز ہوئی اُس میں سید احمد خان صاحب اور اُن کی کمیٹی کی مداخلت قایم رہی اور اکثر وہی لوگ اُس کے ممبر ہوئے قرار پائے جو پہلے سے کمیٹی خزنتہ البضاعۃ کے ممبر ہیں۔ واذا فات الشرط فات المشروط۔ جب جناب مولانا کی شرطوں کو کمیٹی نے پورا نہ کیا تو جناب موصوف کو بھی چندہ ادا کرنے سے انکار ہوا۔ جس کا ادا ہونا انہیں شرطوں کے پورا ہونے پر منحصر تھا +

مگر میرے نزدیک جناب مولانا ممدوح کی یہ کل شکایت اور اُن کا یہ کل خیال غلط ہے اور اُن کا یہ عذر چندہ دینے کے لئے کسی طرح کافی نہیں ہے اور نہ کبھی سید صاحب نے اور مولانا صاحب سے کبھی ایسی شرطیں جن پر جناب مولانا صاحب کی شرکت مدرسۃ العلوم میں منحصر ہوں قرار پائیں۔ اور نہ اُن شرطوں پر جناب ممدوح نے کبھی اپنے چندہ کا دینا منحصر کیا اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ میں کچھ لکھوں اور اُمید ہے کہ جناب ممدوح میری اس جرأت کو معاف فرماوینگے اور اور جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں اُس کو ویسی ہی انصاف کی نظر سے دیکھینگے جس کی مجھ کو اُن سے اُمید ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ میں اس وقت ایک گاؤں میں مقیم ہوں اور کوئی کاغذ مدرسۃ العلوم کے متعلق یہاں میرے پاس نہیں ہے اور اس لئے میں اُس تمام خط و کتابت میں سے جن کا حوالہ اِس مضمون میں دینا ضروری ہے بعض بعض عبارتوں کو بجنسہٖ نقل نہیں کر سکتا لیکن چونکہ وہ سب کاغذ میرے بخوبی دیکھے ہوئے ہیں اس لئے غالب ہے کہ میں کوئی ایسی غلطی نہ کروں گا جس سے اصل مطلب میں کچھ خلل واقع ہووے +

جس عرصہ میں مولوی سید احمد خان صاحب بہادر اور مولوی حاجی علی بخش خان صاحب بہادر کے باہم گورکھپور میں یہ مصالحت واقع ہوئی میں بھی گورکھپور میں موجود تھا اور ہر ایک مجلس اور مشورہ میں شریک رہتا تھا بلکہ خود میں ہی اس باہمی مصالحت کا محرک ہوا تھا اور اسی لئے جب میں نے اول ہی اول یہ

سُنا کہ جناب حاجی صاحب ممدوح کو شرائط صلح کی عدم تعمیل کی نسبت کچھ شکایت ہے اور چندہ دینے اور مدرسۃ العلوم میں شریک ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ تو مجھ کو حد سے سوا افسوس ہوا +

علو جاہ کی تدبیر جو ہم لوگ کرتے ہیں
ہماری سعی باطل دیکھ کر تقدیر ہنستی ہے

خیر وہ تو جو ہوا سو ہوا۔ مگر اب اصل مطلب کی طرف متوجہ ہونا چاہیے +

میں نے جب ابتداءً جناب حاجی صاحب بہادر کی خدمت میں گورکھپور میں مدرسۃ العلوم کا تذکرہ چھیڑا اور ان سے یہ خواہش کی کہ وہ بھی اب مدرسۃ العلوم میں شریک ہو جاویں اور اس کی ترقی میں کوشش فرماویں تو جناب مولوی صاحب ممدوح نے بہت سے گلے اور شکوے کیے اور بہت دیر تک اس باب میں گفتگو فرمائی یہ گفتگو بہت لمبی تھی مگر خلاصہ کلام یہ ہے کہ جناب ممدوح نے فرمایا۔ کہ " میں صرف اس وجہ سے اب تک مدرسۃ العلوم میں شریک نہیں ہوا کہ مجھ کو اس کے طالبعلموں کی مذہبی تعلیم کی طرف سے کبھی اطمینان نہیں ہوا اور ہمیشہ اس بات کا خوف رہا کہ جس قسم کے عقاید سید احمد خاں صاحب کے ہیں ویسے عقاید کی تعلیم اس مدرسہ میں طالب علموں کو بھی ہوگی "۔ میں نے عرض کیا کہ نہیں آپ ایسا خیال نہ فرماویں اور سید احمد خاں صاحب کا کبھی یہ ارادہ نہیں ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے خود ہی اُن کے سامنے یہ تجویز پیش کی۔ کہ اگر اس طرح سے مذہبی کمیٹی بالکل جدا قائم ہو اور اس میں صرف ایسے لوگ شریک ہوں جن پر عموماً مسلمانوں کو اعتماد اور بھروسہ ہو تو آپ کی خاطر جمع ہو جاویگی یا نہیں۔ فرمایا کہ ہاں لیکن سید احمد خاں یا ور کوئی ممبر کمیٹی خزنتہ البضاعۃ کا اس میں شریک نہ ہو میں نے عرض کیا کہ سید احمد خاں آپکے نزدیک قصوروار ہیں وہ شریک نہ ہوں لیکن اور ممبران کمیٹی خزنتہ البضاعۃ نے کیا قصور کیا ہے جو وہ عموماً ناقابل شرکت کمیٹی مذہبی قرار پاویں۔ صرف اتنی بات سے کہ کوئی شخص کمیٹی خزنتہ البضاعۃ کا ممبر ہے دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو سکتا۔ میں نے اُن سے عرض کیا کہ کیا آپ جملہ ممبران کمیٹی سے واقف ہیں۔ کیا آپ کے نزدیک سب بددین اور مرتد ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ کمیٹی خزنتہ البضاعۃ میں ایسے ایسے ممبر بھی ہیں جو شاید سید احمد خاں صاحب کے ہاتھ کا چھوا ہوا پانی بھی نہ پئیں اور آج تک انہوں نے ہمیشہ سید احمد خاں کی باتوں کو محض لغو سمجھا ہے اور کبھی اُن کی بات کا جواب تک نہیں دیا۔ ایسے لوگوں نے کیا قصور کیا ہے جو آپ اُن کو مذہبی کمیٹی میں شریک ہونے سے منع کرتے ہیں۔ اُن میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی دینداری اور تقوی پر ہماری طرح تمام مسلمانوں کو اطمینان ہے پس اگر یہ شرط لگائی گئی تو وہ لوگ اپنے

دل میں کیا کہینگے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ جب عام مسلمانوں کو اُن کی دینداری پر بھروسہ ہے تو وہ کیوں مذہبی کمیٹی میں شریک نہ ہوں۔ پھر میں نے جناب ممدوح کے سامنے محمد عبدالشکور خاں صاحب رئیس بھیکم پور ضلع علیگڈھ اور نواب محمد محمود علی خاں صاحب رئیس چھتاری ضلع بلند شہر کا نام لیا کہ یہ لوگ بھی کمیٹی خزنتہ البضاعۃ کے ممبر ہیں۔ آپ ان لوگوں سے واقف ہیں فرمایا کہ نہیں میں ان کے حالات سے واقف نہیں ہوں (لیکن جناب ممدوح علیگڈھ کے ضلع میں عرصہ تک رہ چکے ہیں اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ اس وقت اُن کا یہ انکار کس مصلحت پر مبنی تھا) میں نے عرض کیا کہ بس اب آپ جب ان کے حالات تک واقف نہیں تو اُن کو ناقابل اعتماد کیونکر تسلیم کئے لیتے ہیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جناب ممدوح اُس وقت کچھ اس تقریر سے کنارہ کرنا چاہتے تھے لیکن میری یہ گفتگو اس قدر صاف صاف تھی کہ کوئی شخص اُس سے انکار نہیں کر سکتا تھا اور بھی جو لوگ وہاں بیٹھے انہوں نے بھی مجھ سے اتفاق کیا اور اُن میں سے جن کو جرأت ہوئی انہوں نے کچھ دبی دبی آواز سے اپنے اُس اتفاق رائے کو ظاہر بھی کر دیا (اس مقام کی باریکی اور خوبی کو گورکھپور والے ہی خوب سمجھینگے) آخر مولانا صاحب ممدوح کو بھی سوائے تسلیم کے اور کچھ نہ بن پڑا اور انہوں نے فرمایا کہ ہاں اگر مسلمانوں کو کسی ممبر کمیٹی خزنتہ البضاعۃ پر بھی اعتماد ہو تو اُس میں کیا عذر ہو سکتا ہے بس اُن کا یہ فرمانا تھا کہ سب قصہ ختم ہو گیا اس لئے کہ مجھ کو خوب معلوم تھا کہ ابتدا سے سید احمد خاں صاحب بہادر کی رائے تھی کہ متواتر کمیٹیوں میں یہ ذکر ہوا تھا کہ مذہبی کمیٹی جدا قایم ہو گی ✦

میں اس مجلس سے بہت خوش خوش اٹھا اور سید احمد خاں صاحب سے یہ سب کہانی بیان کی جن کو میری اس گفتگو کا خیال تک بھی نہیں تھا اور اُن کے بلا کسی قسم کے ایما و اطلاع کے میں نے خود اس بات سے کہ مسلمانوں کے آپس میں اس قسم کی نااتفاقی قایم رہے دق ہو کر اس تحریک میں سبقت کی تھی سید صاحب نے نہایت خوشی سے ان سب باتوں کو منظور کیا اس کے بعد چند اور تحریکیں وغیرہ ہوئیں جن کا بیان میں خلاف رازداری سمجھتا ہوں اس کے بعد جناب ممدوح نے اپنا ابتدائی بانضابطہ خط لکھا جس کا مضمون اب وہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ سید احمد خاں اور کمیٹی خزنتہ البضاعۃ کا کوئی ممبر مذہبی کمیٹی میں شریک نہ ہوں ✦

اگر میری یاد نے خطا نہیں کی ہے تو اس خط کا مسودہ بھی خود میرے سامنے لکھا گیا تھا ایک میز پر شمع کے سامنے ایک شخص لکھتا جاتا تھا جس کا میں نام نہ لونگا۔ اور جناب مولانا صاحب ممدوح بتلاتے جاتے تھے اُن کی زبان سے پھر وہی لفظ نکلا کہ سید احمد خاں اور ممبران کمیٹی خزنتہ البضاعۃ کی

مداخلت کمیٹی مذہبی میں نہ ہو ۔ میں نے پھر قلم کو روکا اور پھر عرض کیا کہ یہ بات ایک دفعہ طے ہو چکی ہے
اور یہ ہو نہیں سکتا چنانچہ جناب ممدوح نے یہ لکھنا موقوف کیا اور صرف یہ الفاظ قائم رہے کہ سید
احمد خاں اور ان کی کمیٹی خزنتہ البضاعۃ تعلیم مذہبی میں کچھ مداخلت نہ کرے اور تعلیم مذہبی کیواسطے
علیحدہ ایک کمیٹی قائم ہو سا لخ +

پس جب اس قدر بحث و گفتگو کے بعد ممبران کا لفظ جناب مولانا صاحب کی شرط اور انکے
خطبین سے خارج کیا گیا اور صرف سید احمد خان صاحب اور کمیٹی خزنتہ البضاعۃ کے (جس میں جناب
ممدوح کے نزدیک ملحدین اور مرتدین بھی شامل تھے) عدم مداخلت کی شرط باقی رہی تو اب میں نہایت
ادب کے ساتھ جناب ممدوح سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آیا اُن کا یہ فرمانا سچ ہے کہ کمیٹی
خزنتہ البضاعۃ سے اُن کی مراد بالانفراد اس کمیٹی کے ہر ایک ممبر سے تھی ۔ اور اگر جناب موصوف اب
بھی یہ فرما دینگے ۔ کہ ہاں یہی مراد تھی تو میں آسمان کی طرف دیکھکر اور ایک آہ بھر کر چپ ہو رہوں گا اور
اُن سے کچھ نہ کہوں گا اس لئے کہ وہ میرے نزدیک ہر طرح واجب التعظیم ہیں ان کو روضہ منورہ
جناب رسالت مآب سے سید الحاج کا معزز خطاب عنایت ہوا ہے مگر یہ ضرور کہوں گا ۔
کہ سخن فہمی عالم بالا معلوم +

لیکن ابھی انصاف دنیا کے پردہ سے بالکل اُٹھ نہیں گیا ہے اس مضمون کے پڑھنے والے خود
انصاف کر لینگے کہ جناب سید الحاج صاحب کا کمیٹی خزنتہ البضاعۃ کی عدم مداخلت کی شرط سے
اب یہ استدلال کرنا کہ اس کمیٹی کا کوئی ممبر اس شرط کے بموجب مذہبی کمیٹی میں شریک نہیں ہو سکتا اور
ان کا بیدھڑک مشتہر کر دینا کہ ہم سے صاف یہ شرط ہو گئی تھی کہ اُس کمیٹی کا کوئی ممبر مذہبی کمیٹی
میں شریک نہ ہو آیا صحیح ہے یا جناب سید الحاج صاحب کی دیانتداری پر ایک بہت بڑے الزام
کا موجب ہے اور جو شخص سید احمد خاں صاحب کی طبیعت اور جناب سید الحاج صاحب کے اقتدار اعظم سے
آگاہ ہیں کیا وہ اس بات کو سنکر بے اختیار ہنس پڑینگے کہ سید صاحب نے ایک جناب مولوی حاجی
علی بخش خاں صاحب بہادر کے شریک کرنیکی غرض سے آنکھوں پہ ایسی ٹھیکری رکھ لی ہوگی کہ
محمد عبد الشکور خاں صاحب اور نواب حاجی محمد محمود علی خانصاحب اور مولوی حافظ محمد اسمٰعیل صاحب
اور مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب او راپنی کمیٹی خزنتہ البضاعۃ کے اور اکثر دیندار اور پرہیزگار
ممبروں کے ارتداد و الحاد کو قبول کر لیا ہو جس کی وجہ سے جناب سید الحاج صاحب کمیٹی خزنتہ
البضاعۃ کے کسی ممبر کو بھی مذہبی کمیٹی میں شریک کرنا نہیں چاہتے تھے اور نہ جناب اُس ایر

رضامند ہیں +

مجھے یقین ہے کہ ہر ایک شخص جس کو خدا نے کچھ بھی عقل دی ہو گی اِس مضمون کے پڑھنے کے بعد ایک لمحہ بھر بھی کبھی اس بات کا یقین نہیں کریگا کہ جناب سید الحاج صاحب کے اس عذر میں کچھ بھی سچائی اور راستبازی حاصل ہے +

اب میں دوسری شرط اور اُس کے نقض کی نسبت کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں اور پھر اپنے اُسی دعویٰ کا اعادہ کرتا ہوں جو میں شروع مضمون میں بیان کر آیا ہوں کہ جناب مولانا صاحب کی شرکت مدرسۃ العلوم کے لئے ہرگز یہ شرط قرار نہیں پائی ہے۔ اور نہ اس شرط پر کبھی جناب ممدوح کا چندہ ادا ہونا منحصر ہوا تھا +

یہ بات کہ مذہبی کمیٹی کے ممبروں کا تعین اور ان کا انتخاب صرف جناب مولانا صاحب کی رائے پر منحصر ہو اُن شرطوں میں سے کوئی شرط نہیں تھی جن کو جناب انہوں نے اپنی طرف سے منظوری کے لئے پیش کیا تھا پھر اس کی تعمیل کمیٹی خزنۃ البضاعۃ یا سید احمد خاں صاحب کے ذمہ کس طرح واجب قرار پا سکتی ہے جناب سید الحاج صاحب بہادر بھی خدا کی عنایت سے ایک عدالت کے قاضی القضاۃ ہیں۔ کیا اُن کے نزدیک کبھی کسی مدعی کو اُس کے دعویٰ سے زیادہ کی ڈگری دی جا سکتی ہے +

یہ بات سید احمد خاں صاحب کی نہایت صفائی قلب کی تھی کہ جب انہوں نے جناب سید الحاج صاحب کی زبان سے یہ سُنا کہ میری مخالفت مدرسۃ العلوم سے ابتک صرف اسلام کی خیر خواہی کے لحاظ سے تھی تو انہوں نے فوراً اِس بات کا یقین کر لیا کہ ایسا شخص ضرور مسلمانوں کی خیر خواہی کریگا۔ اور انہوں نے اُس وقت اپنے نزدیک جناب ممدوح کو ہر طرح اس کام کے لائق سمجھا اور اُن کی پیش کی ہوئی شرطوں کو تمام منظور کر کے نہایت گرمجوشی سے اپنی طرف سے یہ فقرہ اور مستزاد کیا کہ "اس مذہبی کمیٹی کے ممبروں کی تعداد اور ان کا ابتدائی منتخب کرنا یہ بھی سب آپ ہی کے ذمہ ہے۔ اور میں اور ممبروں سے اُس کی منظوری طلب کرتا ہوں" دو ممبر جو وہاں موجود تھے (اور جن میں سے ایک میں بھی تھا) انہوں نے بھی اسی خیال سے اُس وقت سید صاحب کی رائے سے اتفاق کیا اور یہ سوچے کہ کہیں خدا کسی طرح مسلمانوں کے اس باہمی اختلاف کو بھی دور کرے۔ جو ہماری قومی ترقی کے کاموں میں حارج ہے۔ لیکن وہاں مضمون اس کے بالکل برخلاف نکلا ؎

ما زیاران چشم نیکی داشتیم خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم

اور ممبروں کے پاس سے جو جواب آئے اُن میں اکثروں نے سید صاحب کے اس طبعزاد مستزاد

سے اختلاف کیا یہ تو سب نے لکھا کہ مذہبی کمیٹی بلاشبہ جدا ہونی چاہیئے۔ جس میں مسلمانوں کے معتمد علیہ لوگ شریک ہوں لیکن اس کو پسند نہ کیا کہ صرف مولوی علی بخش خاں صاحب بہادر کی اکیلی رائے سے لوگوں کی دینداری یا بددینی کا فیصلہ عمل میں آوے پس جب ممبروں نے کثرت سے اس سے اختلاف کیا تو اکیلے سید احمد خاں کی کچھ پیش نہ چلی اور کمیٹی خزنتہ البضاعت نے ایک اور نہایت ہی عمدہ طریقہ اختیار کیا۔

ممبران موصوف کے جس قدر خط گورکھپور میں سید صاحب کے پاس آ چکے تھے اور جس میں مذکورہ بالا اختلاف بڑے شد و مد کے ساتھ بہت کثرت سے موجود تھا یہ سب خط سید صاحب نے جناب ممدوح کو ملاحظہ کرا دیئے تھے۔ اور خود میں ہی اُن خطوں کو لیکر گیا تھا اور اُن کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا۔ کہ اب یہ بڑی ذمہ واری کا کام کمیٹی خزنتہ البضاعتہ صرف میرے اکیلے کی رائے پر منحصر نہ کریگی اور پھر ان سب واقعات کے بعد گورکھپور میں وہ جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں جناب سید الحاج صاحب بہادر نے آٹھ سو روپیہ چندہ کے لکھے پس بعد معلوم کر لینے ان سب حالات کے کون شخص ہے جو یہ بھی کہہ سکیگا۔ کہ جناب ممدوح کا چندہ اس شرط بہ مشروط تھا۔ اور اس شرط کا نقض عمل میں آیا اور اگر اب بھی کسی کو اس میں شبہ باقی رہ گیا ہو تو میں اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح طور پر اس کو ثابت کر سکتا ہوں۔

گورکھپور کی مجلس میں جس وقت چندہ کی فہرست پیش ہوئی تو سب سے پہلے جناب مولانا صاحب کے سامنے خود میں نے اُس فہرست کو پیش کیا۔ جناب مولانا ممدوح نے آٹھ سو روپیہ چندہ کے اُس میں درج فرمائے اور اپنے دستخط ثبت کئے اور اُس کے بعد انہوں نے کچھ اور عبارت لکھنی چاہی میں نے جھک کر اُس کو دیکھا مولانا صاحب اس قدر لکھ چکے تھے کہ مسجد اہل سنت و جماعت کے واسطے اُس کے بعد انہوں نے اپنی شرطوں کی منظوری کا تذکرہ اور لکھنا چاہا میں نے اُس وقت اُن کو ذرا روکا اور آہستہ سے عرض کیا کہ شرطوں سے کونسی شرطیں مراد ہیں آپ کی شرطیں صرف وہ ہیں جو آپ کے خط میں ہیں۔ اور یہ میں نے اسی لئے عرض کیا تھا۔ کہ جو بات سید صاحب نے اپنے خط میں اپنی طرف سے بڑھا دی تھی اور اُس کی نسبت ہر طرف سے ممبروں کے انکار اور اختلافات چلے آتے تھے کہیں اس کو مولانا صاحب شرط میں داخل نہ کر دیں جناب ممدوح بھی خوب طرح اس بات کو سمجھے اور انہوں نے اُس کے بعد یہ لکھا کہ بعد تعمیل ہو جانے شرائط مندرجہ خط جناب کے ہمارا یہ چندہ فہرست چندہ میں درج کیا جاوے۔ پس

اب جناب ممدوح مہربانی سے ارشاد فرمادیں کہ کیا یہ بات سچ ہے۔ کہ یہ دوسری شرط بھی انکے چندہ سے متعلق تھی۔ اگر فرمادیں کہ ہاں تو میں پھر وہی عرض کرونگا۔ جو اوپر عرض کر چکا ہوں۔ کہ سخن فہمی عالم بالا معلوم شد لیکن کیا کوئی شخص اب یہ کہہ سکیگا کہ جناب ممدوح کا چندہ ان شرطوں پر مشروط تھا نہیں کبھی نہیں +

اب میں نہایت ادب سے جناب ممدوح کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ آپکا چندہ صرف اس بات پر مشروط تھا کہ مذہبی کمیٹی جدا قائم ہو۔ سید احمد خاں یا کمیٹی خزنتہ البضاعۃ کو اس میں کچھ مداخلت نہ ہو۔ ایسے لوگ اُس کمیٹی میں شریک ہوں جن پر مسلمانوں کا اعتبار ہو۔ خواہ وہ پہلے سے کمیٹی خزنتہ البضاعۃ کے ممبر ہوں یا نہ ہوں (جیسا ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں) پس اب جناب ممدوح انصاف سے دیکھ لیں کہ اُن سب شرطوں کی تعمیل جیسی چاہئیے تھی ویسی ہے۔ بلکہ اُس سے بھی زیادہ خوبی اور احتیاط کے ساتھ ہوگئی ہے یا نہیں۔ اِس وقت کمیٹی جدا قائم ہے اور اُس کو ایسے لوگوں نے مقرر کیا ہے جن کا نام اس غرض کے واسطے تین مہینے سے زیادہ اخبار وں میں مشتہر ہو چکا تھا اور کسی مسلمان نے اُس پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ سید احمد خاں یا کمیٹی خزنتہ البضاعۃ کو اُس کمیٹی کی کارروائی میں کچھ بھی مداخلت نہیں ہے۔ وہ کمیٹی اپنی کارروائی آپ کر رہی ہے۔ اور اب مذہبی تعلیم کے لئے کتب درسیہ کا سلسلہ پیش کرنے والی ہے۔ غرض ہر طرح سے جناب ممدوح کی وہ شرائط جن پر اُن کا چندہ ادا ہونا منحصر تھا۔ پوری ہو چکی ہیں۔ اب یہ وقت ہے۔ کہ جناب ممدوح چپ چپاتے آٹھ سو روپیہ کا نوٹ رجسٹری کرا کر سید احمد خاں صاحب کے پاس بھیجدیں۔ لیکن یہاں حسب حال مجھ کو یہ شعر یاد آیا۔ ؎

گر جان طلبی مضائقہ نیست
زر می طلبی سخن درین است

وَالسَّلام

مضامین سیّد محمود صاحب

شدّت اتقا

ہم کو اپنے ایک دوست کا قول خوب یاد ہے کہ پرہیزگاری اور اتقا ہر مسلمان کے لئے لازم ہے ہم خود اس کے قائل ہیں پس اس مختصر مضمون کے لکھنے سے ہماری یہ غرض نہیں کہ اتقا فی نفسہ اچھا نہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا منظور ہے کہ اتقا کو حد شرعی سے زیادہ لیجانا اچھا نہیں ہے بہت سے ہمارے ہم مذہب جو کہ نہایت نیک اور پابند شرع ہیں اکثر اپنی نیک نیتی کی زیادتی کے سبب ایک بڑی غلطی میں پڑتے ہیں یعنی اتقا کو اچھا سمجھ کر اس قدر حد کو پہنچاتے ہیں۔ کہ فی الحقیقت جو غرض شارع کی اتقا کی تقلید سے تھی وہ جاتی رہتی ہے شاید اس سے بڑھکر کوئی غلطی نہیں ہو سکتی۔ کہ کسی شے کو نیک یا مفید سمجھکر اس کو مقدار مناسب سے زیادہ اختیار کرے اور اس بات کو خیال میں نہ رکھے کہ شرع میں کس قدر جائز ہے ہمارے مذہب کے ایک بڑے شخص نے شارع اور شرع اور امت کی طبیب اور دوا اور مریض سے تمثیل دی ہے۔ یہ تمثیل حقیقت میں نہایت عمدہ ہے۔ اور اس ہی سے ہم اپنے قول کو ثابت کرینگے۔ اگر کوئی مریض نسخہ میں یہ پڑھکر کہ تولہ بھر گلقند چار روز متواتر کھانے سے اچھا ہو جاؤں گا یہ نتیجہ نکالے کہ گلقند ایسی دوا ہے کہ میرے مرض موجودہ کو فائدہ بخش ہے تو یہاں تک اس کا نتیجہ درست ہوگا۔ کیونکہ بلاشبہ گلقند اسکے مرض کے لئے مفید ہے ورنہ طبیب ہرگز نہ لکھتا۔ پھر اگر دوسرا نتیجہ یہ نکالے کہ تولہ بھر تو چار دن میں اچھا کرتا ہے تو چار تولہ ایک ہی دن میں اچھا کر دیگا۔ اور آدھ سیر تو کھاتے ہی شفا یاب ہو جاؤنگا۔ یہ نتیجہ بالکل غلط ہوگا کیونکہ آدھ سیر گلقند کا ایک مرتبہ کھا لینا شفا بخشنے کی عوض اور مضر ہوگا۔ اور جو مقصد طبیب کا نسخہ میں گلقند کے لکھنے سے تھا وہ ہرگز حاصل نہ ہوگا۔ اور مریض طبیب کو خوش کرنے کے بدلے اسکو اور ناراض کر دیگا۔ ایسی حالت اتقا کی ہے کہ مقدار مناسب یعنی حد شرعی سے زیادہ ہو کر شدت اتقا نام اتقا ہے ◆

اگر ہماری تمثیل مذکورہ بالا سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اتنا اتقا جس کو ہم شدت اتقا کہتے ہیں کرنا فائدہ کی عوض نقصان کرتا ہے تو بلاشبہ ایسا اتقا شرعاً ناجائز ہے یہی باعث تھا کہ ہمارے رسول خدا صلعم نے اس قسم کی عبادت کو جس سے کہ دنیا کے تمام کاروبار میں خلل واقع ہو منع فرمایا ہے۔ لارھبانیۃ فی الاسلام حدیث صحیح ہے اور اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شرعی حد سے زیادہ اتقا کرنا جائز نہیں۔ بلکہ اس کا نام اتقا نہیں۔ کلام مجید میں بھی اس مقدار مناسب سے زیادہ عبادت کرنے کا ذکر آیا ہے یا ایہا المزمل قم الیل الا قلیلاً۔

یہ بات تمام دلائل عقلی سے بھی ثابت ہے کہ زیادہ ہر شے کی اچھی نہیں جبکہ ہم اس بات کو مانتے ہیں کہ اللہ تعالے نے ہم کو اسلام ایسی نعمت عطا فرمائی ہے کہ جس سے دنیا و دین دونوں کی بہتری حاصل ہو تو کیا صاف ظاہر نہیں ہے کہ ایک ہی کے پیچھے ہو رہنا نصف فائدہ کھونا ہے عین کلام اللہ میں اللہ تعالے نے ہم کو دعا سکھائی ہے ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار۔ دنیا اور دین دونوں کے لئے دعا مانگی ہے۔ اور اس سے بھی ہمارے قول کی تائید ہوتی ہے۔

تمام دنیا اس بات سے متحیر ہے کہ اسلام نے وحشی عربوں کو یکبار دنیا اور دین دونوں کی خوبیاں کیونکر دیں اسی بات سے اسلام کو اور مذہبوں پر فوقیت ہے۔ کہ اور دین تو صرف بہبودگی آخرت سکھانے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ اور اسلام میں جس قدر احکام ہیں اُن سے بہبودگی دارین حاصل ہوتی ہے۔ اس کی ہزار مثالیں ہیں۔ ایک ادنے بات شراب و خنزیر اور قمار کی ممانعت ہے۔ کہ اس کے فواید بیان سے باہر ہیں۔ حکمائے یورپ نے ثابت کیا ہے کہ شراب و لحم الخنزیر نہایت مضر ہیں۔ اور یورپ کی قوموں نے شراب خوری اور قماربازی کے بند کرنے کے لئے قانون بنائے ہیں۔ یہ قانون اب حال میں بنے ہیں۔ اور اسلام میں قریب تیرہ سو برس ہوئے موجود تھے۔

ہماری اصل غرض یہ ہے کہ حد شرعی سے زیادہ اتقا کرنا گویا کہ شارع سے بھی زیادہ متقی ہونے کا دعوی کرنا ہے اور یہ درست نہیں ہم کو ایک نہایت بزرگ شخص کی نقل یاد ہے کہ انہوں نے اتقا کہ اس درجہ کو پہنچایا تھا کہ کافر کی شکل دیکھنے کو گناہ سمجھتے تھے اس اندیشہ سے کہ کافر کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہوگا ریل کا سفر مباح نہیں سمجھتے تھے۔ دنیا دار لوگوں کو ترک کر کے رات دن نماز وظیفہ میں مشغول رہتے تھے۔ اگرچہ یہ بزرگوار بسبب اپنی نیکی کے بیشک تعظیم اور ادب کے لائق تھے لیکن

اُن کے حال پہ بلاشبہ افسوس آنا چاہیئے ایسا شخص جو کہ تمام دنیا کی صحبت چھوڑ بیٹھتا ہے گویا ایک نہایت خود غرض شخص ہوتا ہے کہ جس کو اوروں کو فائدہ دینا کچھ منظور نہیں صرف اپنی آخرت کے چین کے لئے یہاں محنت کرتا ہے بیشک و شبہ اللہ تعالیٰ نماز و وظیفہ سے خوش ہوتا ہے مگر اس سے صرف اُن گوشہ نشین صاحب کا فائدہ ہے اور نہ کسی اور کا ❊

بڑا فائدہ نیک ہونیکا اوروں کو نیکی سکھانا اور اُن کی خدمت کرنا ہے اور نہ خود غرضی سے صرف اپنی عاقبت کی فکر کرنا جو شخص لوگوں کی صحبت اس طرح پر ترک کر بیٹھتا ہے اس سے وہ فائدہ کبھی ظہور میں نہیں آتا جو کہ نیک آدمی کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے نیک آدمی کو نیکی کرتے دیکھکر اور نیک باتیں کرتے سُن کر خود نیکی کو دل چاہتا ہے اور نیکی پھیلتی ہے رسول خدا صلعم اور اصحاب کرام نے دکھا دیا کہ کیونکر اس دنیا میں زندگی بسر کرنی چاہئے ❊

ایک اور صاحب کا ذکر ہم نے سنا ہے کہ جنہوں نے حج کا اس طرح پر قصد کیا تھا کہ ہر قدم پر دو رکعت نماز پڑھتے جاتے تھے مگر یہ اُن سے پورا نہ ہوا اور اگر ہوتا بھی تو شاید صرف بحکم انما الاعمال بالنیات اُن کو ہوتا ورنہ ایسے جوگیوں کی طرح حج کو جانا کہاں درست ہے ہمکو حج کرنیکا ثواب بقدر اُن تکلیف کے جو کہ قصداً انسان اپنے پر ڈالے ہوگا تو ہندو جوگیوں کی طرح زمین پر لوٹ کر حج کو جانے سے تو شاید سب سے زیادہ ثواب ہو۔ مگر اسلام میں ایسی لغو ناحق کی تکلیف اٹھانی درست نہیں لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا ❊

بعض ہمارے ہم مذہب مسلمان بھائی بلاشبہ نیک نیتی سے تعصب کو اتقا اور جہالت کو پرہیزگاری سمجھتے ہیں حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ اگر ہم سچے اور پکے مسلمان ہیں تو شاید ہماری صحبت سے کافر مسلمان ہو جاویں وہ کافر کی زبان یا علوم تحصیل کرنے کو گناہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اگر ہم اُن کو جیسا کہ ایمان دار ہیں تو مخالفین اسلام کے علم کو سیکھ کر اُن کے ساتھ مناظرہ کرنے کے خوب قابل ہونگے اور اسلام بجائے کمزور ہونے کے اور مستحکم ہوگا ❊

انگریزی علوم تحصیل کرنے کو ہمارے متعصب بھائی مسلمان گناہ سمجھتے ہیں حالانکہ خلفائے بغداد کے زمانہ میں جس قدر علم عربی میں آیا وہ سب زبان کو یک یعنی یونانی سے ترجمہ کیا گیا اور اُس زمانہ کے اکثر علماء گو یک کو جو کہ کفار کی زبان تھی بدرجہ تکمیل تحصیل کرتے تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو جس قدر علم کے ہمارے ہاں موجود ہے کچھ نہ ہوتی اور فلسفہ اور منطق کا تو نام بھی نہ ہوتا ❊

الغرض جو فائدہ کہ اپنے مخالف کے عقیدوں کے معلوم کرنے سے ہوتے ہیں وہ متعصب

جلاتے رہتے ہیں ۔ اور ہم خود جہل مرکب ہیں پڑے رہتے ہیں ۔

لیکن یہ جاہلانہ تعصب فی زمانناً محض ہمارے ادبار و کم بختی کے سبب ہم مسلمانوں میں آگیا ہے ورنہ زمانہ قدیم میں کفار کی زبان تحصیل کرنا کچھ بُرا نہ سمجھا جاتا تھا۔ حضرت شیخ سعدی رحمہم اللہ نے زبان لیٹن نہایت محنت سے تحصیل فرمائی تھی ۔ اور وہ لوگ جنہوں نے کہ تصنیفات ارسطو اور افلاطون اور سقراط کا ترجمہ عربی میں کیا وہ کہ ایک سے خوب ہی واقف ہوں گے ۔

ہم کو اس مختصر مضمون کے لکھنے سے نہ تو اُن صاحبوں کو جن کو اتقا کا دعویٰ ہے ناراض کرنا منظور ہے اور نہ یہ ہے کہ ہم اپنے تئیں ناصح بننے کے لائق سمجھتے ہیں بلکہ چند اپنے خیالات اُن صاحبوں کے لیئے درج کرتے ہیں جو کہ جاہل رہنے اور متعصب ہونے کو تقوے سمجھتے اور اُن کو جو کہ میں اہل اسلام کی ترقی اور بھلائی کے خواہاں ہیں مخالفین اسلام میں شمار کرتے ہیں ؀

دوستی کا برتاؤ

تہذیب الاخلاق کے نمبر اول جلد دوم میں ہم ایک مضمون دوستی پر لکھ چکے ہیں ۔ اس میں ہم نے صرف اصول اور فوائد دوستی پر بحث کی تھی اس مضمون میں دوستی کے برتاؤ کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کرنے منظور ہیں ؀

سب اس بات کو مانتے آئے ہیں کہ دوستی انسان کی راحت کو دوچند اور مصیبت کو نصف کر دیتی ہے یعنی ہماری خوشی میں دوست بھی ہمارے ساتھ خوش ہو کر اُس خوشی کو دوچند کر دیتا ہے اور غمی میں دوست کی ہمدردی سے رنج کا آدھا بوجھ ہم پر سے ٹل جاتا ہے اگرچہ یہ قول بالکل سچائی پر مبنی ہے ۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ بہت سے دوست رکھنے بہتر ہیں عقلاء متقدمین میں سے ایک کا قول ہے کہ " بہت سے ہوا خواہ بنا مگر دوست بہت کم سب کے ساتھ امن سے رہ مگر ہزار میں سے ایک کو اپنا صلاح کار بنا یعنی دوستی کم آدمیوں سے کر اور کسی کو دشمن نہ بنا کیونکہ دوستی کا نباہنا مشکل ہے دوستوں کی تعداد کے ساتھ ہماری مشکل بڑھتی جاتی ہے اور دشمن سے اپنے تئیں محفوظ رکھنے میں ہمیشہ دقت ہوتی ہے بگڑے ہوئے دوست سے زیادہ کوئی خطرناک دشمن نہیں وہ ہمارے عیوب اور بھیدوں سے واقف ہوتا ہے ۔ اور ہزار ہا ایسی ضرریں پہنچا سکتا ہے ۔ جو کہ ناواقف دشمن کے اختیار میں نہیں ہو سکتیں ؀

سب سے آسان دوستی وہ ہے جس کا ہم نے اپنے مضمون سابق میں اوّل ذکر کیا تھا یعنی وہ جو کہ بغیر

آپس کی شناسائی کے ہوتی ہے ایسی محبت میں ہمیشہ ہم کو اختیار رہتا ہے کہ کس قدر دوستی رکھیں اور
اس کے بالکل موقوف کرنے میں کچھ اندیشہ نہیں ہوتا کیونکہ اُس حالت میں کوئی ایسا دشمن نہیں بنتا
مگر یہ دوستی ادنےٰ قسم کی دوستیوں میں شمار ہوتی ہے اور چونکہ جس قدر دوستی کی مقدار قلیل ہوتی
ہے۔ اُسی قدر اُس سے حظ اور فائدے بھی کم حاصل ہوتے ہیں پس صرف اسی دوستی پر قناعت
کرنی نہ چاہیئے ۔

البتہ دوسری قسم کی دوستی جس کا اب ہم ذکر کرتے ہیں سب سے زیادہ کارآمد ہے اور عام بہ نافع
میں آتی ہے یعنی وہ محبت والفت جو کہ بسبب ربط وارتباط کے پیدا ہوتی ہے اور جس سے صحبت کی
خوشی اور اصلاح کی درستی مترتب ہے سب سے مقدم شرط اس دوستی کی یہ ہے کہ دونوں شخص اپنے مرتبہ دنیوی
کو بالکل بھول جاویں۔ اور گویا ایک دوسرے سے دولت ومنزلت میں بدرجہا بڑھکر ہو اپنی حالت دوستی
میں ایک دوسرے کو برابر سمجھے بعد اس شرط کے ثابت قدمی اور صداقت طینت ہے یعنی تلون مزاجی
اور بدباطنی دونوں میں نہ ہو ایسے دو شخصوں میں کامل دوستی نہیں ہوتی جن میں سے ایک اپنے تئیں
دوسرے سے اعلیٰ سمجھے یا جو کہ ثابت قدم اور صاف باطن نہ ہو لیکن بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ
جو دوستی میں اپنے رتبہ کو خیال میں نہ رکھیں۔ اور یہی سبب ہے کہ مختلف درجہ کے آدمیوں
میں دوستی کا ہونا شاذ ونادر ہے ۔

ہم یہ پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ سچے دوست سے بڑھکر دنیا میں کوئی دولت نہیں وہ رنج وخوشی میں
یکساں ہماری ہمدردی کرتا ہے مگر ہم کو اُس سخت عیب کا ذکر نہ بھولنا چاہیئے جو کہ دوستی کے ایک بڑے
حظ کو خراب کر دیتا ہے ہماری مراد اُس بیہودہ شغلے سے ہے جس کو دل لگی یا ہنسی یا مزاح کہتے ہیں
ہم ہنسی یا مزاح کے فی نفسہ دشمن نہیں بلکہ ضرور ہے کہ جب دو دوست بالکل کھل مل جاویں تو آپس میں
اپنی خوشی کے لئے کچھ ہنسی کی باتیں کریں مگر ہم اس طرز ہنسی کے برخلاف ہیں جس سے اکثر محبت میں
فرق آتا ہے یہ وہ طریقہ مزاح کا ہے جس سے دوست بجائے خوش کرنے کے رنج دیتا ہے یعنی اپنے
دوست کی کسی سچ بات سے ہنسی کرنی مثلاً ہمارے دوست میں ایک عیب ظاہری ہے اب ہنسی میں
اُس عیب کی طرف کسی قسم کا اشارہ گویا اُس کے برے ہونے کو جتانا ہے اور یہ بالکل نامناسب ہے
کیونکہ وہ ہنسی ہنسی نہیں جو کہ سچ ہو بلکہ ایک نوع کی گالی ہے اور اپنے دوست کی ہجو اور اہانت
کرکے اُس کو رنج دینا ہوتا ہے ۔

علاوہ اس طرز ہنسی کے آجکل ایک اور طرز دوستی کا یعنی آپس میں گالم گلوچ ہونا کمال محبت

سمجھی جاتی ہے اس جگہ اس کی مذمت کرنی ہم ضرور نہیں سمجھتے کیونکہ ایسی بحث زیادہ تر اس موقع پر چسپاں ہوگی جہاں کہ شریف شخص کی تہذیب کا ذکر ہو +

ایسے بھی لوگ ہیں جو کہ نہایت مختصر عرصہ میں بڑی دوستی کا دعوے کرنے لگتے ہیں اور گو دل میں محبت نام کو بھی نہ ہو مگر ہمارے ساتھ ہر قسم کی ہنسی کا اپنے تئیں مجاز سمجھتے ہیں۔ اکثر ایسے ہی لوگ رنج دل میں ڈالنے والی ہنسی کے بہت شوقین ہوتے اور خود بیہودہ خوشی حاصل کرتے ہیں۔ مگر اس سے بھی بدتر ایک اور کمینی عادت ہے کہ ہنسی کے پردہ میں کسی کو طعنہ دینا یا ایسی بات اشارۃً کہنی جو کہ حقیقت میں ان کو کہنی منظور تھی مگر اپنی بد باطنی کے سبب صاف نہ کہہ سکتے تھے۔ یہ بات ذرا غور سے سمجھ میں آوے گی۔ اگرچہ ہر شخص کو اپنی زندگی میں ایسے لوگوں سے پالا پڑتا ہے +

اصلی ہنسی وہ ہے جو کہ ایسی بات کی نسبت ہو جو کہ ہمارے دوست کا عیب نہیں یا جس کے ذکر سے اُس کو رنج نہ ہو یا ایک قسم کی بات گڑھنے سے اگر ہمارے دوست کو کچھ جھنجھلاہٹ ہووے تو وہ غصہ ہرگز نہ ہوتا نہیں ہوتا اور نہ اُس سے کچھ ہرج ہو بلکہ تھوڑے عرصہ کے بعد سب کو اس سے خوشی ہوتی ہے خود اُس دوست کو کہ جس کی ہنسی کی گئی تھی لطف آتا ہے ہم کو یہ بھی بیان کرنا ضرور ہے کہ ہنسی میں کوئی جھوٹ بات بیان کرنی جائز نہیں سوائے اُس کے جس کی غلطی صریح ہو ایسا جھوٹ جھوٹ نہیں کیونکہ وہ اپنے جھوٹ ہونے کو خود صاف دکھاتا ہے اور اس سے کسی قسم کا ہرج نہیں ہوتا +

ایک اور بات پر غور کرنا چاہیے یہ مقولہ سب دوستوں میں مشہور ہے کہ دوست کا مال اپنا ہی ہوتا ہے۔ یہ نہایت اعلیٰ اور عمدہ قول ہے۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ اس کا بھی برتاؤ بری طرح پر ہوتا ہے۔ اکثر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص اس سبب سے کہ کوئی شے نہیں رکھتا کہ اس کے ملاقاتی اس کے پاس وہ شے نہیں پہنے دیتے دوست ایسی شے نہیں چھوڑتے۔ یہ اکثر سننے میں آتا ہے۔ کوئی شے اس سے زیادہ شریف اور اعلیٰ نہیں کہ محبت میں اپنے اور اپنے دوست کے مال کو ایک سمجھے اور اپنی سب چیزوں کو گویا اس کے لئے سمجھے مگر اس سے زیادہ کوئی حقیر بات نہیں کہ باوجودیکہ ہم کو معلوم ہے کہ ہمارے دوست کو ایک شے نہایت پسند ہے اور اس لئے اس کو عزیز رکھتا ہے۔ پھر بھی ہم اس سے اس شے کی درخواست کریں غور کرنے کی بات ہے کہ اس کا اصول کس قدر غلط ہے۔ اگر ہم اپنے دوست کی ایسی شے کو پسند کریں جس سے اُس کو کسی قسم کی آسائش یا خوشی ہو تو کس قدر محبت کے خلاف ہے کہ اُس سے وہ لیکر دوست کی خوشی یا آسائش میں خلل انداز ہوں اگر وہ شے ہماری دانست میں عمدہ ہے ہم کو

چاہئے کہ یہ خواہش کریں کہ ہم سے پہلے ہمارا دوست اچھی شے رکھے۔ اور خوشی اور آسائش حاصل کرے نہ یہ کہ اُس سے وہ بیکر محبت کے برخلاف بات کریں۔ باوجودیکہ ہماری دانست میں اپنا اور دوست کا مال ایک ہے لیکن تاہم اُس سے وہ چیزیں لینی چاہئیں جو کہ ہماری ہی دانست میں عمدہ ہیں۔ مگر اس کو کچھ چنداں عزیز نہیں یا اُس حالت میں اُن کی درخواست کی جائے جبکہ ہم کو کچھ نہ ہو۔ کہ اُس خاص شئے کے لینے سے ہم اپنے دوست کی آسائش سے (جو کہ اُس خاص چیز سے اس کو ہوتی ہے) بدرجہا بڑھکر ہوگی۔ اکثر اس طرح بھی محبت میں فرق آتے دیکھا ہے کہ ایک شخص نے اپنے دوست سے ایک شئے کی درخواست کی اور اُس نے انکار کیا تو ظاہر ہے کہ محبت میں فرق پڑا۔ سچی دوستی کا ایسی حالت میں یہ مقتضی ہے کہ اگر درخواست کنندہ کو یہ معلوم نہ ہو کہ فلاں شئے دوست کو نہایت عزیز ہے اور اس ناواقفیت کی حالت میں درخواست کرے تو معلوم ہونے پر اپنی درخواست کو واپس کرنے اور اُس شئے کے نہ لینے پر مصر ہو۔ اس بات کو غور سے سمجھ لینا چاہئے کہ کسی شئے کا جو کہ ہمارے دوست کو عزیز ہے مانگنا اُسی قدر محبت کے خلاف ہے۔ جس قدر کہ اُس دوست کا اُس شئے کو درخواست کے بعد نہ دینا اگر کوئی وجہ خاص ایسی درخواست یا انکار کی ہو تو سچے دوستوں کو لازم ہے کہ صاف بیان کردیں اور نہ یہ کہ محبت میں خلل آنے دیں +

کیا اچھا قول ہے کہ دوست حقیقی ایک بہت مضبوط بنیاد ہے اور جس نے ایسا دوست پالیا گویا ایک بڑا خزانہ پایا سچا دوست زندگی کے امراض کی دوا ہے اور جو لوگ دل سے نیک ہیں اپنی نیکی کے صلہ میں ایسا دوست پاوینگے" اسی سے خوبصورت اور غور و تامل کے لائق اس مقولہ کا اخیر حصہ ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ اپنی طبیعت کی نیکی اور دل کی صفائی کے بغیر ہم کو سچا اور وفادار دوست نہیں ملتا۔ ع

دل بدل رہ است درین گنبد سپہر

وہ شخص جو کہ خود صاف اور نیک ہے ضرور کبھی نہ کبھی اپنا دوست پاویگا اور گو اپنی صفائی کے سبب اُس کو کبھی بد لوگوں سے مضرت پہنچے مگر بلاشبہ سچے دوست کے ملنے سے محروم نہ رہیگا مگر بد باطن کو کبھی اچھا دوست نصیب نہیں ہوتا۔ اگر اُسی کی سی خاصیت کا شخص ملا تو وہ اس کی نسبت ایسا ہی شبہ کریگا جیسا کہ یہ اس کی نسبت اور کبھی کھلکر دوستی نہیں ہوگی۔ اگر بد باطن شخص کسی صاف باطن سے ملے تو اس کو اُس کی نسبت بھی بد طینتی کے سبب شبہ رہیگا۔ اس بات کی فکر میں رہیگا کہ اُس کے بھید معلوم کروں اسی خواہش میں مبتلا ہو کر چھپ چھپ کر باتیں سنیگا اور اگر اتفاقاً کوئی ایسی بات سُن

پائی جو اس کی دانست میں اُس کے برخلاف ہوئی۔ تو اُس کو اپنی غنیمت تصور کر کے اپنے دل میں اپنے تئیں مبارک باد دیگا۔ کہ کس ہوشیاری سے بھید معلوم کیا گو یا وہ بات جو کہ اس نے چھپکر سُنی (اور اس طرح پر بات سُننے اور چوری میں کچھ فرق نہیں) ایسی ہو کہ اُس صاف باطن شخص کو اس کے رُو برُو کہنے میں بھی کچھ تامل نہ ہوتا ایسے شخص کو کبھی سچے دوست کی سی نعمت نصیب نہیں ہوتی تعجب نہیں کہ تھوڑے عرصہ تک صاف باطن اس بد باطن شخص کو اچھا اور صادق دوست سمجھے مگر نہایت جلد اس کے حرکات سے اُس کی خاصیت کھل جاتی ہے اور صاف آدمی اپنے اس ملاقاتی سے متنفر ہو جاتا ہے ۔

جتنا دوست پُرانا ہو جاتا ہے اتنی ہی قدر بڑھتی جاتی ہے اور گو اکثر ہم کو نئے دوست کی وفا پر اتنا ہی بھروسہ ہو جاتا ہے جتنا کہ پُرانے دوست پر مگر تاہم پُرانے دوست کیساتھ زیادہ تجربہ زندگی کا ہوتا ہے اور اسی وجہ سے کہ وہ قدیم ہے اُس کی قدر زیادہ ہوتی ہے مگر کھری دوستی بڑے اندیشہ کی شئے اور اُس کے برقرار رکھنے کے لئے ہم کو بڑی احتیاط لازم ہے۔ ایک دفعہ دوستی ٹوٹنے کے بعد گو عقلمند اور عالی ہمت شخص اُس شخص کا جو کہ اُس کا دوست تھا قصور معاف کر دیگا۔ مگر پھر دوستی کا ہونا مشکل ہے اور میری دانست میں اُس شخص سے جو کہ ہمارے ساتھ دوستی کا دعویٰ کر کے ہمارے ضرر کی بات دانستہ کرے دوستی پھر نہ کرنی چاہیئے گو اُس کا قصور بالکل دل سے معاف کر دیں اور صلح کر لیں۔ اگر یہ معلوم ہو جاوے کہ وہ حرکت جس سے ہم نے ناراض ہو کر ملاقات ترک کی تھی حقیقت میں دشمنی کی نہ تھی۔ تو پھر محبت کے جاری کرنے میں کچھ ہرج نہیں۔ اور ایسی بات کو اگر کوئی شخص معاف نہ کرے تو وہ بہت بے رحم اور بے مروت سمجھا جانا چاہیئے ۔

ایک عقلمند کا مقولہ مشہور ہے کہ "اپنے دشمنوں سے دُور رہو اور دوستوں سے ہوشیار" گو یہ قول ایک دانا شخص کا ہے۔ مگر ہم اس کے اخیر حصہ سے متفق نہیں۔ وہ دوستی کیا جس میں کہ دوست پر کچھ بھروسا نہ کیا جاوے اور وہ محبت کیا کہ جس میں اپنے دوست کی وفا پر شبہ ہے۔ شاید یہ قول دنیا کے کاروبار میں نہایت ٹھیک ہو۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے خیالات دوستی کے قطعاً برخلاف ہے۔ اس مقولہ سے گو یا یہ سکھاتا ہے کہ دوست کو بھیدوں سے مطلع نہ کرے مگر ایسی حالت میں سب سے بڑا فائدہ دوستی کا جاتا رہتا ہے۔ وہ شخص نہایت نادان بلکہ احمق ہے جو کہ اپنے دوست کے بھیدوں سے دوسروں کو مطلع کرتا پھرے۔ ہم کو اختیار ہے کہ جس کو چاہیں اپنا راز دار بنا دیں مگر یہ بیشک امانت کے برخلاف ہے کہ اپنے دوست کے بھیدوں کو غیروں پر کھولا

دیجیے۔ الغرض اپنے دوست کی بڑی خاطرداری لازم ہے۔ اور کوئی بات اُس کو رنج دینے والی
نہ کرنی چاہیئے۔ ع،

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

بڑے دوست کی فدائی محبت کے برخلاف بات سے بڑا رنج ہوتا ہے اور ایک دفعہ ایسی
دل شکنی کے بعد دوستی کا جاری رہنا دشوار ہے۔ کیونکہ۔ ع،

دل را شکستہ ند کہ گوہر شکستہ

ہم نے اپنے مضمون سابق میں (جس کا یہ مضمون گویا تتمہ ہے) اُن فوائد کا ذکر کیا تھا۔ جو کہ
ہمارے دوست سے ہم کو ہوتے ہیں یہ سب فائدے اکثر دوست کے اپنے بغیر کچھ تکلیف اٹھائے
یا کچھ دولت صرف کئے نہیں ہوتے اور اس لئے اُن کے سبب ہم پر اُس کا بڑا احسان ہوتا ہے ایسے
احسان کے معاملہ میں صرف اُس سے محبت زیادہ کرنی چاہیئے اور مقولہ مشہور حسابِ دوستاں در دل کا
نہایت غلطی پر مبنی ہے اگر اس مقولہ کے معنے یہ سمجھے جاویں کہ جب کوئی دوست ہمارے لئے اپنی کچھ
دولت صرف کرے یا کسی اور طرح ہم کو ممنون کرے تو اس کا احسان کو ہم اپنے دل میں رکھیں اور
موقع پر اُس کو اتار دیں ہم اس بات کے بیان کرنے سے باز نہ رہیں گے کہ یہ معنی اس مقولہ کے ہماری رائے
میں محض غلط ہیں جس وقت کہ ہم اس اصول کو قبول کر لیں تو ظاہر ہے کہ اپنے دوست کا احسان لینا
گویا قرض لینا ہے اور ضرور ہے کہ ایسے احسان کا بوجھ اس قدر ناگوار ہوتا ہے کہ برداشت نہیں
ہو سکتا قرض کو تو بوقت مقدور اتار بھی سکتے ہیں۔ مگر ایسے احسان سے تو جان چھڑانی مشکل ہوتی
ہے۔ اس لئے بدلے اس کے کہ ضرورت کے وقت اپنے دوست کی سعی و کوشش کو کام میں لاویں
ایک خواہش اس کے برخلاف پیدا ہو جاتی ہے فی الحقیقت دوستی مثل بازار میں سودا خریدنے
کے ہو جاتی ہے احسان لیا اور اتار دیا جیسے سودا لیا اور دام ادا کئے دوست کی دوستی سے کیا
فائدہ ہا اگر اس کے احسان کو ہم اپنے پہ بار یا قرض سمجھیں ہاں یہ محبت کا مقتضی ہے کہ جہاں تک
ہم سے ہو سکے اپنے دوست کی بہبودگی کے لئے کوشش کریں مگر اس سعی کو اس نیت سے کرنا
کہ اُس کا احسان ہم پر سے ٹل جاوے بد باطنی میں داخل ہے۔ احسان ہم پر سے کبھی ٹل نہیں
سکتا کیونکہ احسان کنندہ کو احسان کرتے وقت کچھ معاوضہ ملنے کی توقع نہیں ہوتی وہ صرف از
راہ محبت ایک کام ہمارے فائدہ کا کرتا ہے۔ اس سے ہم اُس کے ممنون ہوتے ہیں۔ ایسا احسان
صرف اس سبب سے کہ ادا کیا گیا ہے لینے کے ہزار احسانوں سے کم نہیں اُتر تا بعض لوگ اس نیت

سے احسان کسی پر کرتے ہیں کہ وہ شخص ہمیشہ اُن کا ممنون رہے ایسی حالت میں گو اُس شخص کو ہمیشہ احسانمند رہنا زیبا ہے مگر اُس احسان کی خود قدر گھٹ جاتی ہے ایسے ہی احسان کرنے والے لوگ احسان جتایا کرتے ہیں۔ اور در واقع میں احسان کر کے بھول جانا یا سوائے محبت کے اور کسی قسم کی عوض کی امید نہ رکھنا بہت عالی ہمت اور شریف لوگوں کا کام ہے ۔

گو دیر کے فقروں میں دوست کے احسان اتارنے کی خواہش کو ہم بُرا کہہ آئے ہیں اگر ہم اس بدباطنی کی بھی مذمت کرتے ہیں جو کہ خواہش مذکورہ بالا کی ضد ہے یعنی اس بات کی خواہش رکھنا کہ جس دوست پر ہم احسان کر چکے ہیں اُس کا احسان نہ لینا چاہیئے تاکہ ہمارا احسان اُس پر سے اُتر نہ جاوے جس شخص میں ایسی خواہش ہوتی ہے وہ کبھی سچا دوست نہیں ہوتا اور اُس کا احسان نہایت ناگوار گذرتا ہے۔ کیا اُس نے ہم کو بے لیس یا بے مقدور سمجھ کر احسان کیا تھا یا یہ کہ ہم کو فقیر و ذلیل اور اپنے تئیں امیر و کبیر اور ہم سے مرتبہ میں اعلےٰ سمجھتا ہے کہ ہم جو اُس کی خدمت محبت سے کرنی چاہتے ہیں اُس کے قبول کرنے میں اُس کو عار ہے ہاں اگر دوست کو تکلیف دینے میں ہم کو تامل ہو تو یہ عین محبت ہے مگر اس غرض سے اس سے کسی بات کی درخواست نہ کرنی یا اس کی دولت کے نہایت قلیل حصہ کو بھی اپنے لئے صرف نہ ہونے دینا کہ ہم پر اُس کا احسان نہ ہونے پاوے یا یہ کہ ہمارا احسان اُس پر سے نہ اتر جائے۔ بدباطنی اور نفاق میں داخل ہے ۔

ایک اور بات کا ہم مختصر ذکر کرتے ہیں۔ زندگی کے تجربہ سے اکثر معلوم ہوا ہے کہ جب کبھی دوستوں میں لین دین شروع ہوا دوستی میں غالباً خلل واقع ہوتا ہے اس لئے ہماری دانست میں دوست کو ہمیشہ قرض حسنہ دے کہ اگر بالفرض وہ ادا نہ کر سکے تو محبت شکنی نہ ہو یہ بہتر ہے کہ اگر دوست قرض مانگے تو صاف بیان کر دے کہ مقدار خاص سے زیادہ وہ دے نہیں سکتا اور اگر ایسے انکار سے کوئی دوست ناراض ہو تو اُس کا قصور ہے ۔

ہم نے ایک بڑے شخص کے منہ سے یہ مقولہ سُنا ہے کہ "دوست را میازما" مگر اس کے معنے ہرگز یہ نہیں کہ اس کے احسان لینے سے یا وقت ضرورت مدد کی درخواست کرنے سے عار رکھنے بلکہ یہ معنی ہیں کہ بلا ضرورت صرف اپنے دوست کی وفا آزمائی کے واسطے اُس سے کوئی درخواست نہ کرنی چاہیئے کیونکہ آزمانا صرف شبہ کی حالت میں ہوتا ہے اور وہ دوست صادق نہیں جو اپنے دوست کی وفا پر شبہ کرے زمانہ خود ہر شخص کی خاصیت کو کھول دیتا ہے پھر ہم کیوں اپنے دوست کی نسبت بدگمانی کریں جہانتک ممکن ہو اس کو اپنا دوست سمجھیں اور اگر اخیر کو وہ

بہ باطن نکلے تو صرف خاموش اور علیحدہ ہو جاویں۔ مگر اول ہی آدمی کے پہچاننے میں ہم کو احتیاط چاہیئے۔ تاکہ آخر کو ندامت نہ ہو۔ ع

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

یونی ورسٹی کیمبرج

کیمبرج ایک ولایت کا چھوٹا سا قصبہ قریب ساٹھ میل کے لندن سے واقع ہے چھ سو برس سے زیادہ گذرے کہ ایک امیر پادری نے ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنی جائداد اُس کو دیدی جس کی آمدنی سے خرچ چلتا تھا اور اس آمدنی سے معلموں کی تنخواہ اور غریب طلباء کو وظیفے ملتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس مدرسہ کی جائداد کی قیمت بڑھتی گئی اور امیر لوگ بھی اپنی اولاد کو تعلیم کے لئے بھیجنے لگے۔ پھر اور مدرسے بھی قائم ہوئے اور اب وہاں سولہ کالج ہیں جن سے قریب تین ہزار آدمی کے تعلق رکھتے ہیں۔ مدرسہ کی بنیاد اس طرح پر پڑی ہے کہ کسی شخص نے اپنی جائداد ایک مدرسہ کی بنیاد کے لئے دی۔ اُس کی آمدنی سے ایک مکان بنا جس میں کہ طالب علموں اور معلموں وغیرہ کے رہنے کی جگہ ہوا اور پھر اُس آمدنی میں سے اُس مدرسہ کا خرچ چلتا ہے اُسی کی آمدنی میں سے سالانہ انعام اور طلباء کے وظیفے دیئے جاتے ہیں۔ ہر مدرسہ کے انتظام کی صورت یہ ہے کہ ایک عہدہ دار جس کو کالج کا ماسٹر کہتے ہیں تنخواہ پاتا ہے اس عہدہ دار کا کام پڑھانا نہیں ہے۔ بلکہ مدرسہ کے انتظام کا اور اُس کی جائداد وغیرہ کی آمدنی کا نگراں حال رہتا ہے۔ اس عہدہ دار کو قریب ہزار روپیہ ماہواری کے اور ایک عمدہ مکان جو کہ کالج سے متعلق ہوتا ہے بلا کرایہ رہنے کو ملتا ہے۔ یہ شخص سب سے بڑا عہدہ دار ہے اور اپنے مرنے تک اُس عہدہ پر مامور رہتا ہے۔

پھر کالج کے فیلو ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہ امتحان میں نہایت عمدہ رہتے ہیں اور ہر شخص قریب تین ہزار روپیہ سال کے وظیفہ پاتا ہے۔ اُن لوگوں کو رہنے کے لئے کالج میں مکان ملتے ہیں اور اگر چاہیں تو پڑھاویں ورنہ بلا کسی خاص کام کے اُن کو سالانہ تنخواہ ملے جاتی ہے مگر جب شادی کرتے ہیں تو بند ہو جاتی ہے اور وہ فیلو نہیں رہتے۔ یہ لوگ ہمیشہ نہایت عالم ہوتے ہیں اور اُن کو بلا کسی خاص کام کے تنخواہ دینے سے یہ غرض ہے کہ وہ علم کی ترقی کریں۔ اور عمدہ کتابیں عام فائدہ کے لئے لکھیں مگر اصل سبب یہ ہے کہ اُن کو تنخواہ اس لئے دی جاتی ہے کہ بہت سے جوان شخص فیلو ہونے کے لئے کوشش کریں اور علم تحصیل کریں۔ مثلاً جو امتحان کہ فیلوشپ حاصل کرنے کے لئے ہے وہ نہایت

مشکل ہے بلکہ شاید دنیا میں اُس سے زیادہ مشکل امتحان علوم میں نہیں ہے ہر سال کے شروع میں مدرسوں میں طالب علم داخل ہوتے ہیں اور تین برس کے بعد ڈگری حاصل کرتے ہیں ڈگری کے امتحان میں جو طالب علم کہ عمدہ رہیں اُن کو فیلو بنایا جاتا ہے مگر ابھی تک فیلوشپ (یعنی عہدہ فیلو) صرف اُن لوگوں کو دیا جاتا ہے جو کہ زبان لیٹن اور گریک میں یا علوم ہندسہ اور ریاضی میں عمدہ امتحان دیں اس بات کی بحث ہے کہ اور علوم میں اچھا امتحان دینے والوں کو بھی ملے اور یقین ہے کہ چند سال میں اور علوم کی تحصیل کرنیوالوں کو بھی فیلو بنایا جاویگا +

ہر کالج میں مختلف تعداد فیلو کی ہے مگر اوسط قریب پندرہ فیلو فی مدرسہ ہیں ان سب کا کام ملکر بندوبست کالج کا کرنا ہے۔ ان کی ایک کونسل ہوتی ہے جس کا پریسیڈنٹ کالج کا ماسٹر ہوتا ہے اور ہر امر کا تصفیہ کثرت رائے پر منحصر رہتا ہے +

فیلو مدرسہ کی مختلف جماعتوں کو پڑھاتے ہیں مگر اس کی تنخواہ ان کو الگ ملتی ہے جو فیلو کہ طالب علموں کو درس دیتے ہیں وہ اکثر سب سے زیادہ عالم ہوتے ہیں اور انکو ٹیوٹر یعنی استاد کہتے ہیں +

جب کہ کالج کا ماسٹر مرتا ہے تو ان فیلوں میں سے ایک شخص آپس کی رائے سے چُنا جاتا ہے اور وہ ماسٹر بنا دیا جاتا ہے اور اپنے مرنے دم تک اُس عہدہ پر رہتا ہے غرضیکہ ہر امر متعلق مدرسہ فیلوں کی رائے سے قرار پاتا ہے +

جب کوئی فیلو شادی کرتا ہے تو اُس کو اپنی فیلوشپ چھوڑنی پڑتی ہے اور اس کی جگہ پھر اور کوئی شخص جس نے کہ نہایت اعلےٰ امتحان دیا ہو فیلوں کی رائے سے مقرر ہو جاتا ہے ہر سال قریب ایک یا دو فیلوشپ کے خالی ہوتے ہیں۔ اور اُن کی جگہ جو طالب علم کہ اُس سال میں عمدہ امتحان دیتے ہیں مقرر ہو جاتے ہیں +

اکثر یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص علم دوست دو یا تین ہزار روپیہ کالج کو اس غرض سے دیتا ہے کہ اُس کی سالانہ آمدنی سے اُس طالب علم کو جو کہ مضمون خاص میں سب سے عمدہ امتحان دے انعام ملے۔ اکثر یہ انعام کتابوں کا ہوتا ہے ایسے انعام کا نام اکثر اُس کے مقرر کرنے والے کے نام پر رکھا جاتا ہے +

ہر کالج کے ساتھ ایک کتب خانہ متعلّق ہے جس میں سے طالبعلم کتابیں مستعار لا سکتے ہیں اس کتب خانہ کا ایک داروغہ ہوتا ہے جو کالج سے تنخواہ پاتا ہے +

ہر کالج میں ایک ہال یعنی بڑا کمرہ ہوتا ہے جس میں کہ شام کا کھانا سب طالبعلم اور فیلو ساتھ کھاتے ہیں۔ اسی کمرہ میں سالانہ امتحان وغیرہ ہوتے ہیں +

ایک اَور کمرہ واسطے کونسل فیلوں کے ہوتا ہے اور مہینہ میں ایک یا دو دفعہ سب فیلو جمع ہو کر امور مدرسہ کی بحث کرتے ہیں ❊

ہر مدرسہ سے ایک چھوٹا سا گرجہ متعلق ہوتا ہے جس میں سب طالب علم جو کہ عیسائی مذہب رکھتے ہیں، صبح اور شام عبادت کرتے ہیں۔ فیلوں میں سے ایک شخص جو کہ پادری ہو عبادت کراتا ہے اور گرجہ کا انتظام رکھتا ہے ❊

کالج کا ایک پھاٹک ہوتا ہے اور ایک دربان مقرر ہوتا ہے جو کہ وقت معمولی پر شام کو دروازہ بند کر دیتا ہے۔ اکثر قریب نو بجے شام کے پھاٹک بند ہو جاتا ہے۔ بعد اس کے کالج میں کوئی شخص نہیں آ سکتا ❊

ہر طالب علم کے پاس دو کمرہ ہوتے ہیں۔ ان کمروں کا مختلف کرایہ ہے اور طالب علم موافق اپنی حیثیت کے کمرے لیتے ہیں ان کمروں میں سے ایک میں پلنگ اور منہ دھونے کی میز اور کپڑوں کی الماری وغیرہ ہوتی ہے۔ اور دوسرے میں میز اور کتابوں کی الماری اور کرسیاں اور اکثر ایک کوچ ہوتی ہے۔ یہ کمرہ پڑھنے لکھنے اور دوستوں سے ملنے کے لئے ہوتا ہے اس کمرہ کے دروازہ کے دو کواڑ ہوتے ہیں ایک باہر کی طرف اور ایک اندر کی طرف۔ جب طالب العلم اپنے کمرہ میں نہیں ہوتا تو باہر کے کواڑ کو بند کر جاتا ہے یا یہ کہ اگر اس کو یہ منظور ہے کہ کوئی شخص اس کے پڑھنے میں ہرج نہ ڈالے تب بھی وہ باہر کا کواڑ بند کر کے اندر تحصیل کرتا ہے۔ یونیورسٹی کا یہ دستور ہے کہ اگر باہر کا کواڑ بند ہو تو کھٹکھٹاتے نہیں۔ کیونکہ اگر طالب علم کچھ یاد کر رہا ہو۔ تو اس کی تحصیل میں خلل نہ ہو صبح کا کھانا اور دوپہر کی چائے وغیرہ طالب علم اپنے کمرہ میں کھاتے پیتے ہیں۔ لیکن شام کا کھانا ہال میں کھانا ضرور ہے یہ طریقہ بود و باش کا ہے۔ اب میں مختصر طرز پہ طریقہ تعلیم بیان کرتا ہوں ❊

جب کوئی طالب علم کالج میں داخل ہوتا ہے تو اس سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ کس علم کو تحصیل کرنا چاہتا ہے اکثر طالب علم جو کہ زبان لیٹن و گریک یا علوم ہندسہ و ریاضی یا اَور کوئی علم پڑھنا چاہتے ہیں تو وہ مدرسہ میں داخل ہونے سے پہلے بھی کچھ پڑھ چکے ہوتے ہیں کیونکہ زبان لیٹن و گریک اس ملک میں اسی طرح پہ بچپن میں پڑھائی جاتی ہے۔ جیسے کہ ہمارے ہاں فارسی اور عربی پڑھائی جاتی ہے۔ غرض کہ ہر طالب علم یہ بات بیان کرتا ہے کہ میں فلاں علم تحصیل کرنا چاہتا ہوں اُس کو پھر اپنی پسند کے موافق کمرے مل جاتے ہیں۔ اور ان میں وہ خود اسباب خرید کر رکھ

۱ یہ دستور ہے کہ جب کوئی شخص کمرہ میں آنا چاہتا ہے تو پہلے ہاتھ سے کواڑ پر کھٹ کھٹ کرتا ہے ❊

لیتا ہے[۱]۔ کالج میں ہر صبح کو اوّل اس کو گرجا جانا ہوتا ہے[۲]۔ پھر بعد صبح کے کھانے کے کالج میں تعلیم کے مختلف کمروں میں درس ہوتا ہے۔ وہ سبق روز ہوتے ہیں۔ اور اُن کے یاد کرنے میں دن اور شام صرف ہوتی ہے +

لیکن اوّل ہر طالب علم خواہ کوئی علم وہ اختیار کرے ایک امتحان دیتا ہے جس میں کہ اُس کو اوّل کامیاب ہونا شرط ہے۔ اس امتحان کے مضامین کچھ بہت مشکل نہیں ہیں مگر ایسے عام ہیں کہ ہر تعلیم یافتہ شخص کو اُن سے واقفیت ہونی چاہیئے۔ مضامین یہ ہیں :-

(۱) زبان لیٹن جس میں ایک کتاب جو کہ مقرر کر دی جاتی ہے +

۲- زبان گریک اس میں بھی ایک کتاب پہلے سے مقرر کی جاتی ہے +

۳- قواعد زبان لیٹن و گریک +

۴- اناجیل اربعہ میں سے ایک انجیل اپنی اصلی زبان گریک میں +

۵- ایک کتاب جس میں کہ عیسائی مذہب کے دلائل بیان ہیں +

۶- حساب جبر و مقابلہ تحریر اقلیدس وغیرہ مضامین مذکورہ بالا کچھ چنداں مشکل نہیں ہیں اور ان میں امتحان بآسانی ہو جاتا ہے۔ مگر بعد اس امتحان کے مضامین مذکورۂ ذیل میں سے طالب علم ایک علم تحصیل کرتا ہے +

مضمون اوّل

علوم میتھے میٹکس جس میں داخل ہیں قریب ۲۶ مختلف شاخیں علوم کی مثلاً علم ہیئت گردش سیاروں کی علم آب و ہوا علم متعلق بہ گردش زمین وغیرہ +

مضمون دوم

زبان لیٹن و گریک معہ تاریخ یونان و روم کبیر اور حالات مختلف مصنفوں کے جو کہ اگلے زمانہ میں عمدہ عمدہ کتابیں لکھ گئے ہیں مثلاً سقراط اور ارسطو وغیرہ +

مضمون سوم

علم مارل سائینسز جس میں شامل ہیں فلسفہ (معہ اصول حکومت) اور منطق اور پولیٹیکل اکانومی

---

[۱] ہر کالج کے متعلق ایک اسباب والے کی دوکان ہوتی ہے۔ جہاں سے کہ اسباب خرید کیا جاتا ہے طالب علم کو مدرسہ چھوڑتے وقت دو تہائی قیمت اُسکے اسباب کی ملتی ہے اور وہ اسباب پھر دوکاندار خرید لیتا ہے +

[۲] جو لوگ کہ عیسائی نہیں ہیں مثلاً یہودی یا مسلمان اُن کو گرجا میں جانا نہیں پڑتا +

یعنی علم انتظام مدن وغیرہ +

مضمون چہارم

نیچرل سائینسز یعنی علوم قدرت جس میں داخل ہیں +

علم کیمسٹری یعنی کیمیا +

ایضاً منرلوجی یعنی علم معدنیات +

ایضاً جیالوجی یعنی علم جمادات +

ایضاً باٹینی یعنی علم نباتات +

ایضاً۔ زوالوجی یعنی علم حیوانات (معہ اندرونی تشریح اُن کے جسموں کی) +

مگر مذکورہ بالا میں سے اکثر صرف دو باتیں ایک شخص اختیار کرتا ہے +

مضمون پنجم

علم الٰہیات یعنی علم متعلق بہ مذہب عیسائی اس امتحان کو وہ لوگ دیتے ہیں جو کہ پادری ہونا چاہتے ہیں۔ اس میں زبان عبری اور یونانی کی شرط ہے تاکہ توریت و انجیل کو اصلی زبانوں میں پڑھ سکے سوائے عیسائیوں کے اور کوئی اس امتحان کو نہیں دے سکتا +

مضمون ششم

اصول قوانین اور تواریخ۔ اس مضمون میں داخل ہیں پرانے قوانین جو کہ روم کبیر میں جاری تھے۔ اور جن پر قوانین اقوام یورپ مبنی ہیں اور وہ قانون جس سے مختلف قوموں کے تنازع فیصل ہوتے ہیں اور انٹرنیشنل لا کہلایا جاتا ہے۔ اس مضمون میں تاریخ قانون بھی داخل ہے +

مضمون ہفتم

علوم طب و تشریح وغیرہ۔ اس کی مختلف شاخیں اور مضامین ہیں۔ مگر اُن کا بیان کرنا ضرور نہیں +

مذکورہ بالا سات مضامین سے طالب علم ایک پر اپنی پوری توجہ دیتا ہے اور کالج میں داخل ہونے کے قریب تین سال کے بعد مکان سینٹ ہوس میں (یعنی اُس عالی شان مکان میں جہاں یونیورسٹی کے امتحان ہوتے ہیں اور جس میں کہ ڈگری عطا کرنے کی رسم پوری کی جاتی ہے) امتحان دیتا ہے اور بحالت کامیابی ڈگری عطا ہوتی ہے اور ایک گون یعنی چغا اور ٹوپی بطور سند عطا ہوتی ہے جسکے پہننے کا وہ مستحق ہوتا ہے۔ اور بڑے جلسوں میں اس کو پہنتا ہے

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں یونیورسٹی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ بعد حصول ڈگری وہ شخص اپنی عمر بھر کے لیے یونیورسٹی کا ممبر گنا جاتا ہے اور اس کو سب حقوق حاصل رہتے ہیں۔

اب مختصر حال بیان کرتا ہوں ان متفرقات باتوں کا جو طالب علموں نے خود قائم کی ہیں اس غرض سے کہ جلسوں میں اسپیچ یعنی گفتگو کرنا آوے ایک سوسائٹی قائم کی ہے جس میں مختلف مضامین پر بحث ہوتی ہے۔ یہ سوسائٹی بالکل پارلیمنٹ کے نمونہ پر ہے ہر ایک ممبر کو استحقاق گفتگو کا ہے اکثر وہ لوگ جو کہ پارلیمنٹ کے ممبر ہونے کی تمنا رکھتے ہیں یا بیرسٹر ہونے کو ہوتے ہیں اس سوسائٹی میں گفتگو کی مشق کرتے ہیں مسٹر گلیڈاسٹون وزیراعظم حال ایک ایسی ہی سوسائٹی میں جو کہ اکسفورڈ یونیورسٹی میں ہے اپنے زمانہ طالب علمی میں گفتگو کی مشق کیا کرتے تھے۔ اور لارڈ مکالی ہال کی یونین سوسائٹی کے زمانہ طالب علمی میں ایک نامی ممبر تھے۔ اور پریسیڈنٹ مقرر ہوئے تھے یہ عہدہ ممبروں کے ووٹوں سے ہوتا ہے مگر اکثر سب سے بڑے بولنے والے کو ملتا ہے۔

اسی طرح پر جسمانی مشق کے لیے کلب ہیں اور طالب علم اکثر اپنی فرصت کے گھنٹوں میں دریائے کیم پر (جس پر کیمبرج واقع ہے) کشتی کھیتے ہیں۔

مذکورہ بالا مختصر حال طرز تعلیم یونیورسٹی کیمبرج کا ہوا۔ اب میں چند سطریں اپنی رائے کے بیان کرنے میں لکھتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان کیونکر اپنی تعلیم کر سکتے ہیں۔

تجویز

اس بات کے ثابت ہونے میں اب کچھ شک نہیں رہا کہ جو علوم کہ زبان یونانی سے اگلے زمانہ میں عربی میں ترجمہ کیے گئے تھے۔ ان میں سے اب بہت سے تو غلط ثابت ہو گئے ہیں اور باقی کی اب اقوام یورپ نے اس قدر ترقی کر لی ہے اور تکمیل کو پہنچایا ہے کہ پرانے علوم؎ بڈھی عورت کی سی باتیں معلوم ہوتے ہیں اس بات کو خیال کرنا چاہیے کہ ہمارے علم کی کتابوں میں صرف وہ باتیں ہیں جو کہ حکماء یونان نے اپنے خیال و قیاس سے نکالی تھیں۔ ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ عربی حکماء اور فلاسفہ نے ان کی بہت ترقی کی مگر وہ بھی قریب ہزار برس سے بند ہو گئی اور جو کتابیں کہ اب عربی درس میں ہیں وہ سب نہایت پرانی تحقیقات پر مبنی ہیں مثلاً علم جغرافیہ ہمارے ہاں نہایت غیر مکمل حالت میں ہے اور عربی کتابوں میں اسی حالت میں ہے جو کہ تین ہزار برس ہوئے یونان میں تھا جب کہ امریکہ کا کچھ حال معلوم نہ تھا اور آسٹریلیا کا کچھ گمان بھی نہ تھا۔ یورپ کی ترقی اور تربیت سے تمام دنیا پر سفر کیے گئے۔

؎ میں علوم دین کی نسبت کچھ بحث نہیں کرتا اور نہ ان کو شامل کرتا ہوں۔

اور جزائر وغیرہ دریافت کیے گئے جس قدر کہ متقدمین کو زمین معلوم تھی اس سے اب قریب چوگنی
کے معلوم ہے مگر غیاث اللغات میں زمین کے نقشہ کو انگریزی نقشوں سے ملانے سے معلوم ہوتا ہے
کہ علم جغرافیہ میں کس قدر ترقی ہوئی ہے۔ غرضیکہ سب علوم جو کہ ہمارے ہاں موجود ہیں وہ سب نہایت
پرانی حالت زنگ آلودہ میں ہیں اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ان علوم کو بھی اب مسلمانوں
نے تحصیل کرنا چھوڑ دیا اور دن بدن علوم دینیہ بھی زوال ہے یہ تو مسلمانوں کے علم کا حال ہے اُن کی
معاش کا حال اور بھی بدتر ہے۔ اور دن بدن بدتر ہوتا جاتا ہے ایک نہایت بڑا حصہ مسلمان شرفا زیادہ ہیں
جو کہ اپنی جائداد کی آمدنی پر گذر کرتے ہیں۔ بلکہ شاید سب سے دولتمند مسلمان صاحب جائداد ہیں۔ اس
بات کو خیال کرنا چاہئیے کہ ان میں سے کوئی بھی اپنی اولاد کی تعلیم قرار واقعی نہیں کرتا۔ یہ بیشک اصل حال
ہے۔ اب اس بات پر خیال کرنا چاہئیے کہ موافق شرع شریف مسلمان کی جائداد بعد انتقال کے اولاد میں
تقسیم ہو جاتی ہے تو اس سے یہ نتیجہ صاف ہے کہ امیر سے امیر مسلمان کی اولاد دو یا تین پشت میں
غریب ہو جاویگی اور ملکی لوگوں کی کاہلی مشہور ہے میں ایسی حالت تنزل سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں۔ کہ
پچاس برس کے عرصہ میں مسلمان نہایت بے تربیت یافتہ اور ذلیل و خوار اور مفلس ہو جاوینگے۔ اور خدا
نخواستہ یہ بات بھی ممکن ہے کہ تھوڑے اور زمانہ میں اُن کا ہندوستان میں وہ حال ہو جاویگا۔ جو کہ
ذلیل ترین اقوام ہندوستان کا اب ہے میں اپنی اس رائے کو اس بات سے سہارا دیتا ہوں کہ محمد تغلق
کی اولاد اب دہلی کے قریب پرانے قلعہ میں (جس کا نام تغلق آباد ہے) بستی ہے اور اُن میں سے
کسی کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا اور وہ گھاس کھود کر اپنی روٹی کماتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ شاہزادگان
خاندان تیموریہ اب نہایت ذلیل طرز پر دہلی میں روٹی کماتے ہیں اور کسی کو کسی قسم کا علم نہیں۔
جب کہ ہم اس بات کو خیال میں رکھیں کہ کوئی مسلمان خاندان موجودہ کسی قسم کی ترقی نہیں کرتا اور
یہ بھی کہ کوئی نیا خاندان جاگیر یا جائداد نہیں پاتا (جیسا کہ مغلیہ بادشاہوں کے وقت میں ہوتا تھا) اور یہ
کہ مسلمان دن بدن گورنمنٹ کے معزز عہدوں پر سے کم ہوتے جاتے ہیں۔ تو میری رنج آمیز رائے
ہرگز نادرست نہیں معلوم ہوگی"

اس بات کے مانے جانے کے بعد سوال یہ ہے کہ کیا علاج ؟ اس کا جواب ہم یہ دیتے ہیں۔ کہ
"تعلیم" مگر اس کے ساتھ ہی ہم یہ کہتے ہیں کہ جو طرز تعلیم کا گورنمنٹ نے اختیار کیا ہے وہ ہرگز ہماری حاجات
اور ضروریات کے موافق نہیں۔ گورنمنٹ کالجوں میں تعلیم صرف انگریزی اچھی ہوتی ہے اور اس میں کچھ شک
نہیں کہ عربی اور فارسی کی نہایت خراب تعلیم ہوتی ہے مسلمان نوجوان گورنمنٹ کالجوں میں اپنے مذہب

کی تعلیم نہیں پا سکتے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سب علوم انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں جس سے اُن علوم کی مشکلات دو چند ہو جاتی ہیں یہ سچ ہے کہ بہت سے ایسے علوم ہیں کہ جن کی کتابیں ہماری زبان اُردو میں موجود نہیں مگر اس کا جواب یہ ہے کہ اگر چاہو تو نہایت کم عرصہ میں بہت سی کتابیں ترجمہ ہو سکتی ہیں اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ بات کہ گورنمنٹ اپنے مدارس میں مذہبی تعلیم نہیں دیتی ہرگز گورنمنٹ پر اعتراض نہیں ہے بلکہ ہر تربیت یافتہ اور دانا گورنمنٹ کو ضرور ہے کہ مذہب کے لگاؤ سے بچے مگر یہ بات کہ زبان اردو میں علم کیوں نہیں پڑھائے بلاشبہ بڑا اعتراض ہے۔ اور گورنمنٹ خود اس بات پر اب توجہ دے گی ✤

ہماری غرض یہ ہے کہ مسلمان اپنی تعلیم کو خود سب سے بہتر کر سکتے ہیں اور اگر کوشش و سعی کریں تو نہایت آسانی سے وہ کام کر سکتے ہیں جو کہ گورنمنٹ مشکل سے بھی نہیں کر سکتی ✤

اس ملک کو دیکھو کہ جتنے بڑے مدرسہ اور دارالعلوم ہیں اُن کو گورنمنٹ سے لگاؤ نہیں اور یہاں کے لوگ اپنی تعلیم خود کرتے ہیں اسی یونیورسٹی میں گورنمنٹ ایک پیسہ نہیں دیتی اور اس میں کچھ شک نہیں کہ دنیا میں سب سے بڑا دارالعلوم یہ ہے ✤

بس اب میں کمیٹی ترقی تعلیم مسلمانان کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہوں کہ آپ اپنی عالی ہمتی اور حُبِ وطن کو اس بات کی کوشش میں کام میں لادیں کہ مسلمان اپنی خراب حالت پر غور کریں اور اُس کا علاج اس بات میں سمجھیں کہ ہم میں تعلیم پھیلے۔ ہم خود مدرسہ قایم کریں اور اپنی اولاد کی تعلیم کریں ✤

مگر سب سے مقدم بات یہ ہے کہ ایک بڑا مدرسہ کسی عمدہ شہر میں قائم کیا جاوے جس میں کہ طالب علم اس اصول پر تعلیم پاویں جیسا کہ اس یونیورسٹی میں ہے یعنی یہ کہ مدرسہ میں رہتا ہو اور سب ساتھ کھانا کھاویں اور ہر طالب علم الگ الگ دو دو کمرہ لیکر رہوے۔ اور یہ کہ علوم سب زبان اُردو میں پڑھائے جاویں۔ اور انگریزی صرف بطور ایک زبان غیر کے پڑھائی جاوے بلکہ یہ کہ جس کا دل چاہے پڑھے اور جس کا دل چاہے نہ پڑھے اور جس کا دل چاہے عربی و فارسی میں تکمیل کرے جس کا دل چاہے دین کے علوم تحصیل کرے غرض یہ ہے کہ ایک ایسا مدرسہ ہو جہاں کہ صرف مسلمان اپنی حسب خواہش تعلیم پا سکیں اور اپنے دین کی تعلیم بھی شامل رکھیں ✤

فرض کیجیے کہ علیگڈھ میں یہ مدرسہ قایم ہو تو اس میں کچھ شک نہیں کہ وہاں ہندوستان کے سب طرف سے مسلمان آسانی آسکتے ہیں پنجاب اور اودھ و بہار سب سے ریل علیگڈھ کو جاتی ہے۔ اور سفر کی کچھ دشواری نہیں ✤

یہ بات کہنا کہ مسلمانوں کا مقدور نہیں بالکل غلط ہے کیونکہ ہر محرم میں ہندوستان کے مسلمان فضول باتوں میں لاکھوں روپیہ صرف کردیتے ہیں اور جو کچھ کہ فضول خرچیاں شادیوں میں ہوتی ہیں اُن کا دسواں حصہ بھی نہایت عالیشان دارالعلوم قایم ہونے کے لیے کافی ہے اصل یہ ہے کہ سب سے زیادہ دل کی سعی چاہیے مسلمان کس قدر شوق سے مسجدیں بناتے ہیں مگر اس بات کا خیال نہیں کرتے کہ جب علم دن بدن گھٹتا جاتا ہے تو مدرسہ بنانے سے دس گنا زیادہ ثواب ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کا علم دین خدانخواستہ جاتا رہا تو مسجدیں کس کام آویں گی اور کیا فائدہ ہوگا۔

جیسے مدرسے یہاں موجود ہیں اگر ایسا ایک بھی مدرسہ مسلمان قایم کرلیں تو کل قوم کی ترقی ہو۔ اور دنیا و دین کے مصائب سے نجات پانے کی صورت نکلے۔

مضامین مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی

انبیاء

نبی کی ضرورت پر ایک وجدانی شہادت

جو باتیں انسان کو مذہب نے تعلیم کی ہیں اور جن کو وہ الہامی جانتا ہے وہ عموماً یا تو خدا تعالیٰ کی ذات و صفات سے علاقہ رکھتی ہیں یا اُس جزا و سزا سے جس کا وقت موت کے بعد مقرر کیا گیا ہے۔ اور اس لئے ہم تمام مذہبی تعلیمات کو علم مبدا و معاد کہتے ہیں۔ پس نبی کی ضرورت ثابت کرنے کے لئے ہم کو دو باتوں کا ثبوت دینا کافی ہے ایک یہ کہ مبدا و معاد نفس الامر میں ایسی دو حقیقتیں ہیں جن کا علم حاصل کرنا انسان پر واجب ہے۔ دوسرے یہ کہ مبدا و معاد کا علم نبی کے سوا کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

جس طرح مثلاً عمل کیمیا کے ذریعہ سے ہم اس بات کا مشاہدہ کرا سکتے ہیں کہ پانی بسیط

نہیں ہے بلکہ دو مختلف گاسوں یعنی اوکسیجن اور ہائیڈروجن سے مرکب ہے اس طرح ہم یہ ہرگز نہیں دکھلا سکتے کہ یہ مبدا ہے اور یہ معاد لیکن ہم ان دونوں چیزوں کے وجود پر انسان کی اصل فطرت کو گواہ کر سکتے ہیں۔ اور اس کی گواہی ہمارے نزدیک مشاہدہ سے بھی زیادہ یقینی ہے ✤

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان کا حال جو تفحص کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو ادنے تامل کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس کو اکثر چیزوں کا علم اکتساب سے حاصل ہوتا ہے اور اسکو کسبی علم کہتے ہیں اسی طرح بعضی باتوں کا علم اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے جس کو فطرتی یا وہبی یا قدرتی علم کہہ سکتے ہیں مثلاً ضرورت کے وقت کھانا پینا ✤

دھوپ اور مینہ میں سایہ ڈھونڈنا جاڑے میں گرم ہونیکی تدبیر بہم کرنی یہ باتیں اس کو قدرت کے سوا کسی نے نہیں سکھائیں کیونکہ ہم یہی باتیں اس کے ابنائے جنس یعنی اور حیوانات میں بھی مشاہدہ کرتے ہیں جن کا معلم اور اُستاد قطعاً قدرت کے سوا اور کسی کو نہیں ٹھہرا سکتے۔ اور جب ہم گھونسلا بنانے میں بئے کی کاریگری اور شہد حاصل کرنے میں مکھی کی حکمت اور جالا پورنے میں مکڑی کا ہنر دیکھتے ہیں اور اکتساب کی راہیں چاروں طرف سے مسدود پاتے ہیں تو ہم کو اس بات میں بالکل شک نہیں رہتا کہ قدرتی علم صرف میل طبعی ہی کا نام نہیں ہے بلکہ بعضے ایسے دقائق اور صنایع بھی اس میں داخل ہیں جو بادی النظر میں قوت متفکرہ کے نتائج معلوم ہوتے ہیں ✤

پھر جب ذرا اور تامّل کیا جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی قدرتی علم کے لحاظ سے انسان اور اُس کے ابنائے جنس میں دو طرح کا امتیاز رکھا گیا ہے ایک یہ کہ اور حیوانات کا قدرتی علم ہمیشہ ایک خاص حد پر محدود رہتا ہے کبھی اُس سے تجاوز نہیں کرتا مثلاً جو گھونسلا ابابیل نے نوح علیہ السلام کی کشتی میں بنایا ہوگا اُس میں اور اس زمانہ کے گھونسلوں میں ہرگز کچھ تفاوت نہ ہوگا بخلاف انسان کے کہ اُس کا قدرتی علم ہمیشہ ایک ہی حالت پر نہیں رہتا مثلاً اگر پانچ ہزار برس پہلے کی بعض انسانی عمارتیں اس زمانہ کی عمارتوں سے ملائی جائیں تو شاید اس بات کا یقین بہت مشکل سے آئے کہ دونوں کام ایک ہی نوع کے افراد نے بنائے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اور حیوانات کو صرف وہ باتیں سکھائی گئی ہیں جو اُن کے مصالح جزئیہ اور اغراض محسوسہ کے لئے مفید ہوں۔ اور پوری بھلی طرح اُن کی حاجت رفع کر دیں جیسے بھوک کے وقت دانہ یا گھاس یا گوشت وغیرہ کھا لینا پیاس کے وقت پانی پینا شبق کی حالت میں اپنے مادہ کے ساتھ نزدیکی کرنی۔ دھوپ اور مینہ یا سردی کے بچاؤ کے لئے گھونسلا یا بل یا بھٹ وغیرہ بنانا اپنے بچوں کی ایک خاص مدت تک پرورش کرنی بخلاف انسان کے کہ اس کے

چند میں ان باتوں کے سوا وہ علوم بھی القا کئے گئے ہیں جن کے ذریعہ سے وہ اپنے مصالح کلیہ اور منافع ابدیہ کا سراغ لگا سکتا ہے جیسے جھوٹ یا زنا یا خیانت کو برا جاننا اور سچ یا عدالت یا امانت کو اچھا جاننا +

پھر جب غور اور تامل کیا جاتا ہے تو انسان کے قدرتی اور اکتسابی علم میں تین طرح کا امتیاز ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے ایک یہ کہ قدرتی علم کی اصل تمام نوع میں متحقق ہونی ضرور ہے کیونکہ ہم اس علم کے آثار اور حیوانات میں اسی طرح مشاہدہ کرتے ہیں مثلاً شہد کی مکھی جس طریقہ سے شہد حاصل کرتی ہے اور مکڑی جس ہنر سے جالا پورتی ہے وہ طریقہ اور وہ ہنر اُن کے تمام بنی نوع میں پایا جاتا ہے مگر چونکہ انسان کو خدا تعالے نے عقل عنایت کی ہے اور عقل کا مقتضی تمام افراد میں یکساں نہیں ہوتا اس لئے وہ قدرتی اصل ایک صورت پر قائم نہیں رہتی مثلاً عورت اور مرد کو بغیر کسی تخصیص کے ایک دوسرے پر حرام جاننا ایک عام قانون ہے جو کہ انسان کو قدرت نے تعلیم کیا ہے مگر اُس تخصیص کی صورتیں ہر قوم میں جدا جدا ہیں مسلمانوں کے ہاں اور طریقہ ہے ہندوؤں کے ہاں اور دستور ہے عیسائیوں کے ہاں اور قاعدہ ہے بخلاف اکتسابی علم کے کہ وہ نوع کے بعض افراد میں متحقق ہوتا ہے بعض میں نہیں ہوتا جیسے جیولوجی اور علم برق کہ یہ دونوں علم اہل یورپ کے ساتھ مختص ہیں یا ایک زمانہ میں مختص تھے یا جیسے حرکات کواکب کا علم یا علم ہندسہ کہ ایک زمانہ میں اہل مصر کے ساتھ مختص تھا دوسرے یہ کہ جب انسان کو کوئی ایسی بات تعلیم کیجائے جو قدرت نے اس کو پہلے سے سکھا رکھی ہے تو ضرور ہے کہ وہ بات بغیر دلیل اور برہان کے اسکے دل میں تہ نشین ہو جائے بخلاف اکتسابی علم کے کہ جب تک اُس پر کافی دلیلیں قائم نہ کی جائیں تب تک اس کی صداقت پر ہرگز دل گواہی نہیں دے سکتا مثلاً اگر ہمارے سامنے کوئی یہ کہے کہ گرمی کی شدت میں سرد پانی سے نہایت فرحت حاصل ہوتی ہے تو خواہ اس کا طبعی سبب بیان کرے خواہ نہ کرے ہم کہا سُننے کے تسلیم کرتے ہیں کچھ تردد نہیں ہوتا لیکن اگر وہ ہم سے یہ آکر کہے کہ ہوا دو مختلف گاسوں یعنی نائٹروجن اور اوکسیجن سے مرکب ہے تو ہم اس بات کے خواہاں ہونگے کہ وہ عمل کیمیا کے ذریعہ سے اُنکے اجزا تحلیل کرکے ہم کو دکھاوے تیسرے جو علم انسان کو قدرت نے تعلیم کیا ہے۔ اس میں کبھی خطا واقع نہیں ہوتی ۔ مثلاً ٹھنڈے پانی سے پیاس کا بجھانا جو انسان کو قدرت نے تعلیم کیا ہے اس میں کبھی خطا واقع نہیں ہوتی لیکن مرض کی حالت میں جبکہ پیاس اس قدر بڑھ جائے کہ صرف ٹھنڈے پانی سے فرو نہ ہو سکے اور اُس کا علاج کسی ٹھنڈی دوا سے کیا جائے تو ممکن ہے کہ وہ بالکل فائدہ نہ بخشے یا پیاس

کو اور زیادہ کر دے ٭

ان سب باتوں میں غور کرنے کے بعد سب ہم اپنے اصل مقصود کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ تو ہم کو اس بات کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ کہ جہاں قدرت نے انسان کو اور ہزاروں باتیں تعلیم کی ہیں۔ انہیں باتوں میں سے مبدا و معاد کا اجمالی علم بھی ہے یعنی اس قدر جاننا کہ کوئی ہمارا صانع ہے اور مرنے کے بعد ہم کو کچھ نہ کچھ اپنی برائی بھلائی کا ثمرہ ملنے والا ہے یہ انسان کی اصل فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے کیونکہ جہاں تک ہماری نگاہ پہنچتی ہے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آدمی عام اس سے کہ مذہب کا پابند ہو یا نہ ہو اور عام اس سے کہ الوہیت کا قائل ہو یا منکر بہر حال جس وقت وہ کسی ایسی خطرناک حالت میں پھنس جاتا ہے جس سے باہر ہونے کی کوئی تدبیر نظر نہیں آتی اور جو وسائل پر اس کو بھروسہ تھا وہ سب منقطع ہو جاتے ہیں۔ تو جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے اسی طرح اُس کی عالی توجہ اور باطنی ہمت چاروں طرف سے سمٹ کر ایک ایسی بن دیکھی اور اَن سمجھی ذات کی طرف کھینچتی ہے جس کو وہ اڑے وقت کا سہارا اور اپنی تمام تدبیروں کا منتہا سمجھتا ہے اسی طرح جہاں تک ہم کو معلوم ہے ہم نوع انسان کے کسی فرد کو اس بات سے خالی نہیں پاتے کہ وہ بعضی برائیوں سے نہ کسی دنیوی مضرت کے اندیشہ سے بلکہ ایک ایسے خوف کے سبب سے بچتا ہے یا بچنے کا ارادہ رکھتا ہے جس کا کھٹکا اُس کو مرنے کے بعد ہے اور بعضی بھلائیاں نہ کسی دنیوی منفعت کے لئے بلکہ ایک ایسی توقع پر کرتا ہے یا کرنیکا ارادہ رکھتا ہے جس کے پورے ہونے کی اُمید اُس کو مرنے کے بعد ہے۔ اسی مطلب کو ہم یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ ہر فرد انسانی بعضے کاموں کو نہ کسی دنیوی مضرت یا منفعت کے لحاظ سے بلکہ محض دل کی شہادت سے مذموم یا محمود جانتا ہے حالانکہ کسی شے کو بُرا یا بھلا جاننا اُس کے نتائج کے بُرا یا بھلا جاننے پر موقوف ہے پس اس کے سوا کوئی بات ذہن میں نہیں آتی کہ معاد کا اجمالی علم جو اُس کی فطرت میں رکھا گیا ہے۔ صرف اُس کی ہدایت سے وہ اُن کاموں کو بُرا یا بھلا جانتا ہے ٭

اس ساری تقریر سے یہ نتیجہ نکلا کہ مبدا و معاد کا اجمالی علم انسان کو قدرت نے تعلیم کیا ہے کیونکہ اگر اکتساب سے حاصل ہوتا تو اسکے آثار تمام بنی نوع میں بلا استثنا ہرگز نہ پائے جاتے۔ لیکن یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہ خیالات انسان کی اصل فطرت میں ودیعت نہ کئے گئے ہوں بلکہ مذہبی تعلیمات کے سبب رفتہ رفتہ تمام دنیا میں پھیل گئے ہیں مگر یہ شبہ ہم کو ایک ایسی دلیل کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ جس سے ہمارے مطلب کو اور زیادہ تقویت حاصل ہوتی ہے۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ قدرتی علم

کا ایک یہ بھی خاصہ ہے کہ جب کوئی بات اس کے موافق انسان کو تعلیم کی جاتی ہے تو وہ اُس کو بغیر دلیل اور برہان کے تسلیم کر لیتا ہے۔ پس اگر یہ بات مان لی جائے کہ خیالات مذکورہ مذہبی تعلیمات کے سبب دنیا میں شائع ہوئے تو بھی ہمارا مطلب بعین نہیں جاتا کیونکہ اگر یہ دونوں اصول یعنی مبدا و معاد مجملاً انسان کی فطرت میں مخفی نہ ہوتے تو کسی طرح ممکن نہ تھا کہ سارا جہان ایسی دور از دیدہ باتوں کے تسلیم کرنے پر متفق ہو جاتا جن کا نمونہ سلسلہ محسوسات میں کہیں نظر نہیں آتا۔

ہم اوپر یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ قدرتی علم میں اکتسابی علم کی طرح غلطی اور خطا کا احتمال کبھی نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمیشہ سچا اور مطابق واقع کے ہوتا ہے پس بلکہ ہم یہ بات ثابت کر چکے کہ مبدا و معاد کا اجمالی علم قدرتی ہے اکتسابی نہیں ہے تو ضرور ہے کہ جیسا مبدا و معاد کی نسبت ہمارا اعتقاد ہے اسی طرح واقع میں بھی کوئی ہمارا صانع ہے اور مرنے کے بعد ہماری برائی بھلائی کا ثمرہ ہم کو ملنے والا ہے اور جب یہ بات ثابت ہو چکی کہ مبدا و معاد کا اعتقاد صحیح اور مطابق واقع کے ہے تو ہماری عقل ہرگز جائز نہیں رکھتی کہ جس فیاض حکیم نے بغیر طلب اور خواہش کے اس اجمالی علم کی چاٹ لگا کر اس کی تفصیل کا مشتاق بلکہ ایسا حاجتمند کیا جیسے بیمار دوا کا اور پیاسا پانی کا محتاج ہوتا ہے وہ باوجود ہماری طلب اور خواہش کے اس کی تفصیل کا دروازہ ہم پر نہ کھولے ہمارے نزدیک اگر مبدا و معاد کا تفصیلی علم حاصل کرنے کے وسائل ہم سے منقطع کئے جائیں تو ہمارا حال یا تو بعینہ اُس پیاسے کا سا ہو جس کو ایک سرد اور شیریں اور شفاف پانی کے چشمہ سے دو گھونٹ پلا کر اُس چشمہ کی راہیں چاروں طرف سے مسدود کر دیں یا اُس غلام کا سا حال ہو جس کو اُس کا آقا کسی دور دراز مسافت پر ایک خطرناک رستہ سے بھیجے اور سوا اس کے کہ اُس رستہ کا خطرناک ہونا اُس کو کسی طرح جتا دے اُن خطرات کی حقیقت یا اُنکے موقع و محل سے آگاہ نہ کرے اور کوئی تدبیر ان سے بچنے کی اُس کو نہ سوجھائے کیا ہمارا ولی نعمت جس کو ہم جود و کرم کے ساتھ متصف اور بخل و خست سے منزہ جانتے ہیں وہ ہمارے ساتھ ایسا معاملہ کر سکتا ہے نہیں ہرگز نہیں کر سکتا بلکہ ضرور ہے کہ وہ ہمارے لئے کوئی ایسی شمع روشن کرے جو اس اجمال کے دھندلکے پر تفصیل کی روشنی پھیلا کر ہمارے جہل و تردد کو علم و یقین کے ساتھ مبدل کر دے ٭

یہاں شاید ہمارے دل میں یہ خیال گذرے کہ وہ شمع ممکن ہے کہ ہماری عقل ہو جو کہ ہم میں اور ہمارے ابنائے جنس یعنی اور حیوانات میں ما بہ الامتیاز ہے اور جس کے سبب سے ہم کو تمام محسوسات پر شرف اور فضیلت حاصل ہے اور جس کی بدولت ہمارے بنی نوع پر موجودات عالم کے اسرار روز

بروز کھاتے چلے جاتے ہیں۔ مگر ہم کو اُمید نہیں کہ اس خیال کو ہمارے دام ہیں پانی کے بلبلہ سے زیادہ قیام ہو کیونکہ ہم جو اپنے گریبان میں منہ ڈالکر دیکھتے ہیں تو اپنی عقل کو مبدا و معاد کی حقیقت کے ساتھ وہ نسبت پاتے ہیں جو آنکھوں والے کو ایک اندھیری کوٹھری کے ساتھ ہوتی ہے کیا کسی کو یہ امید ہے کہ آنکھوں کی روشنی ایک کلبہ تیرہ و تار میں کچھ کام دے سکتی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں دے سکتی اسی طرح آدمی کی عقل مبدا و معاد کی حقیقت کا سراغ ہرگز نہیں لگا سکتی۔ بڑے بڑے حکیم اور فیلسوف اور بڑے بڑے محقق دانشمند جنہوں نے سارے جہان کی چیزوں کو چھان مارا اور دقائق اشیاء پر جو جہالت کے پردے پڑے ہوئے تھے اُن کو مرتفع کیا اور قوانین قدرت سے وہ اصول اور قواعد استنباط کئے جنکے سبب سے انسان کے چہرے پر خلافت رحمانی کا منصب دار ہونا کھل گیا جب انہوں نے قدم اپنی حد سے آگے بڑھایا یعنی بے اس کے کہ کسی شمع سے اپنا چراغ روشن کریں اپنی اٹکل سے مبدا و معاد کا سراغ ڈھونڈنے لگے تو صرف یہی نہیں کہ وہ منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے بلکہ انہوں نے ایسی ٹھوکریں کھائیں اور اُن کی رایوں نے ایسی غلطیاں کیں کہ جب اُن کے اور مقالات کے ساتھ اُن رایوں کو دیکھا جاتا ہے تو اُن میں وہ نسبت معلوم ہوتی ہے جو کہ عاقل اور مجنوں کے کلام میں ہونی چاہیئے اور بڑی دلیل اس بات کی کہ یہ گروہ اپنی سعی میں ناکام رہا یہ ہے کہ اُس بے شمار گروہ میں سے شاید دو شخصوں کی رائیں ایسی نکلیں جو کہ باہم اتحاد کلی رکھتے ہوں یہاں ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مطلب کے زیادہ تر دل نشین کرنے کے لئے قدیم مصر والوں کا تھوڑا سا ضروری حال رولن صاحب کی تاریخ سے بطور انتخاب کے نقل کیا جائے ❊

جس طرح اس زمانہ میں اہل یورپ اپنے تئیں پورا شائستہ اور اپنے ماسوا تمام عالم کو وحشی یا نیم وحشی خیال کرتے ہیں اسی طرح" اہل مصر غیر ملکوں کے لوگوں کو وحشی کہا کرتے تھے چنانچہ جب نیکو بادشاہ تخت پر بیٹھا تو اُس نے اول دریائے نیل کی نہر بدستور سابق مدد جاری رکھی مگر پھر ایک غیبی فال سے خوف کھا کر اُس نہر کا بنوانا چھوڑ دیا کیونکہ اس کو یہ بات معلوم ہوئی کہ اس نہر کے بننے سے وحشی قوموں کے لئے مصر میں آنیکی راہ کھل جائیگی " پہلے لوگ مصر کو فنون و آداب سلطنت کا ایک عمدہ مدرسہ جہاں سے علوم کو نشو و نما اور روز بروز ترقی ہو سمجھتے تھے اور حقیقت میں بھی عمدہ عمدہ فن وہاں ایجاد ہوتے تھے اور اس ملک سے نہایت عمدہ عمدہ ہنر اور عجیب عجیب فن اُن لوگوں کو جو علم و فن میں ترقی کرنیکی کوشش کرتے تھے حاصل ہوتے تھے یونان کے بڑے بڑے لوگوں نے مثل ہومر اور فیثاغورس اور افلاطون اور وہاں کے اچھے اچھے مقننوں نے مثل لائیکرگس اور سولن معاو

بہت سے نامیوں کے جن کا بیان یہاں ضروری نہیں بنظر تکمیل علوم مصر کا سفر اختیار کیا اور حضرت لقمان
نے بھی (کتاب مقدس ہیں) اس کی تعریف کی ہے۔ کیونکہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعریف
میں یہ فرمایا تھا کہ وہ مصریوں کے ہر طرح کے علم و ہنر میں کامل تھا ** مصری ایک عجیب طرح
کی موجد طبیعت رکھتے تھے اور ہر کام میں نئے نئے ایجاد نکالتے تھے انہوں نے اپنی طبیعت کو مفید
کاموں کے ایجاد کی طرف متوجہ کیا تھا اور اُن کے زمانہ کے علماء نے جو کہ مصر کے مایہ ناز تھے مصر کو
عجیب عجیب ایجادوں سے معمور کر دیا تھا۔ انہوں نے کسی ایسی چیز سے جس سے طبیعت انسانی کی
تکمیل ہوتی ہے یا جس سے آرام اور خوشی حاصل ہوتی ہے مصر کو محروم نہ رکھا تھا۔ ستاروں کی حرکات
پر وہ لوگ سب سے پہلے مطلع ہوئے اور سب سے پہلے انہوں نے ہی علم ہندسہ ایجاد کیا۔ موجودات
عالم کے حالات اور خواص دریافت کرنے میں یہ لوگ بہت کوشش کرتے تھے ** مصریوں
نے فن عمارت اور رنگ آمیزی اور سنگ تراشی اور اور تمام فنون کو کمال پر پہنچایا تھا ** جن لوگوں
نے قواعد حکمت و حکومت کو خوب سمجھا اُن میں سب سے اول مصری تھے اس قوم نے یہ بات سب سے پہلے
دریافت کی کہ فنون قواعد سلطنت کا اصلی مطلب یہ ہے کہ اپنی زندگی مزے سے کٹے اور رعیت آباد ہے
نگرون کے مقدمات میں جس قدر مصری احمق تھے کوئی نہ تھا۔ بتوں کی بہت کثرت تھی! اور اُن کے معمول
اور اُن کے درجے جدا جدا تھے ان بتوں میں اوسرس اور اسس جن کو وہ چاند سورج تصور کرتے
تھے بہت بڑے بت تھے اُن کی پرستش عموماً ہوتی تھی۔ اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ انہیں سیاروں
کی پرستش سے بت پرستی نے ظہور پایا۔ اُن کے سوا بیل اور کتا اور بھیڑ اور بلی اور باز اور مگرمچھ
اور لنگ کی بھی پرستش ہوتی تھی۔ اور ان میں سے بعض جانور ایسے تھے کہ خاص خاص شہروں
میں پوجے جاتے تھے اور یہ نقشہ تھا کہ ایک قوم ایک جانور کو قبلہ و کعبہ سمجھ کر دیوتا کی طرح پوجتی تھی
اور دوسری قوم اُسی کی صورت سے نفرت کرتی تھی ان جانوروں میں سانڈ ایپس نہایت ممتاز ہوتا
تھا اس کے نام کے بڑے بڑے عالیشان مندر بنائے جاتے تھے اور اس کے مرجانیکے بعد بہ نسبت
اس کے ایام حیات کے اُس کی عزت اور توقیر زیادہ ہوتی تھی۔ تمام مصر اُس کے سوگ میں ماتم کرتا تھا۔
اور اس کی تجہیز و تکفین اس دھوم دھام سے ہوتی تھی کہ اُس پر مشکل سے یقین آتا ہے ٹولیمی لیگس
کی بادشاہت میں جب وہ جانور ضعیف ہو کر مرا تو اُس کے ساز و سامان میں سوائے اخراجات معمولی
کے ایک لاکھ بارہ ہزار پانسو روپیہ صرف ہوا تھا جب اس کی تجہیز و تکفین سے فراغت ہوتی تھی تو
اُس کی جگہ دوسرے کے مقرر کرنے کی فکر ہوتی تھی اور تمام مصر اُس کی تلاش میں جاتا تھا۔ اصل سانڈ میں

چند علامتیں ہونی ضرور تھیں جن کے سبب وہ اور سانڈوں سے ممتاز ہوتا تھا۔ پیشانی پر ہلال کی شکل پشت پر عقاب کی صورت زبان پر بھونری کا نقشہ ہونا ضرور تھا۔ اور جب قسمت سے ایسا سانڈ ہاتھ آجاتا تھا۔ تو تمام مصر میں گھر گھر خوشی ہوتی تھی۔ اور ماتم جاتا رہتا تھا جب شاہ کیمبس۔ اتھوپیا کی مہم سے ناکام آیا تو وہ ایسے دنوں میں مصر پر گذرا کہ مصری سانڈ ایپس کی خوشیوں میں کھیل کود رہے تھے یہ ناکام دل سوختہ اُن کو خوشیاں کرتے دیکھکر یہ سمجھا کہ یہ لوگ میری ناکامی پر ہنستے ہیں۔ اُس نے اُس نئے سانڈ کو جس نے اپنی خدائی کا لطف بہت کم اٹھایا تھا قتل کرا دیا اور تمام مصریوں کو بن خدا کا کر دیا۔ مصریوں نے صرف جانوروں کے آگے خوشبوئیں جلانے پر ہی اکتفا نہ کیا تھا۔ بلکہ اپنے باغوں کے نباتات کو بھی دیوتا سمجھتے تھے۔ نہایت تعجب کی بات ہے کہ جو لوگ تمام دنیا سے فضل و ہنر میں فائق ہوں اور وہ آپ کو ایسا ہی سمجھتے بھی ہوں وہ ایسی حماقت میں گرفتار ہو جائیں اور جھوٹے معبودوں کی پرستش میں ایسے اندھا دھند پڑ جائیں کہ تھوڑی سی سمجھ والا بھی اس کو پسند نہ کرے۔ جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کا مندروں میں پوجنا اور کمال احتیاط سے اُن کو پالنا اور اُن کے قاتلوں سے قصاص لینا اور مرنے کے بعد اُن جانوروں کو عطریات سے بھرنا اور بڑی دھوم دھام سے قبروں میں دفنانا اور رفتہ رفتہ پیاز اور لہسن کو بھی پوجنا اور اڑے وقتوں میں اُن سے مدد مانگنی اور اُن پر بھروسا کرنا ایسی نادانی کی باتیں ہیں کہ اس زمانہ میں اُن پر مشکل سے یقین آتا ہے۔ مگر اگلے لوگ ان سب باتوں پر گواہی دیتے چلے آئے ہیں۔ لوشین صاحب لکھتے ہیں کہ اگر تم کسی ایسے عالیشان مندر میں جاؤ۔ جو سونے چاندی سے جگمگا رہا ہو۔ اور چاند سورج اُس کی ٹیپ ٹاپ کی تاب نہ لا سکیں تو تم کو اُس مندر کے دیوتا کے دیکھنے کا بہت شوق ہوگا اور تم نہایت مشتاق ہو کر جب اندر جاؤگے تو دیکھوگے کہ لنگ لنگ یا بلی یا بندر بڑی شان و شوکت اور تمام کر و فر سے وہاں جلوہ فرما ہیں۔ خدا تعالےٰ نے بیشک اس بات کے دکھلانے کو کہ انسان اگر اپنی عقل پر چھوڑ دیا جائے۔ تو اس کا یہ روپ ہو جاتا ہے کہ اہل مصر جیسے لوگوں کو جنہوں نے عقل انسانی کو نہایت اعلےٰ درجہ پر پہنچا دیا تھا ایسی نفرت انگیز اور بیہودہ بت پرستی میں پھنسا رہنے دیا تاکہ لوگوں کی تماشا گاہ بنیں ؛؛

مصریوں کا یہ عبرت انگیز حال جو رولن صاحب کی تاریخ سے نقل کیا گیا اہل یونان کا حال بھی اس کے قریب قریب تھا اور یہ اس بات کا نہایت کامل ثبوت ہے کہ انسان کی عقل معاش کیسی ہی اعلےٰ درجہ پر کیوں نہ پہنچ جائے مبداء و معاد کا علم حاصل کرنے میں ہرگز کافی نہیں ہو سکتی۔ تاریخ یونان

ہیں لکھا ہے کہ جب ہائیرو بادشاہ سسلی نے حکیم سائمونیڈیز سے باری تعالیٰ کی حقیقت دریافت کی تو اُس نے پہلے دن ایک روز کی اور دوسرے دن دو روز کی مہلت چاہی اور اسی طرح ہر روز مہلت مانگتا رہا آخر ایک دن بادشاہ نے بار بار مہلت مانگنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ یہ مضمون سمجھا در فکر سے اس قدر بعید ہے کہ جس قدر اس میں غور کرتا ہوں اُسی قدر تحیر زیادہ ہوتا ہے اور تاریکی چھائی جاتی ہے اور کنفیوشیس جو حکمائے چین کا سرگروہ اور اہل چین کا مقتدا ہے اور جس کی تعلیمات کا مدار محض عقل ورائے پر ہے جب اُس سے لوگوں نے آخرت کا حال پوچھا تو اس نے اس کا جواب دینے میں اپنی کمال دانائی اور انصاف ظاہر کیا اُس نے کہا کہ جب یہاں کی ہزاروں چیزیں ہماری نظر سے مخفی ہیں۔ تو وہاں تک ہماری عقل کیونکر پہنچ سکتی ہے۔

بہرحال اگر ہماری اس رائے سے جو اوپر بیان کی گئی یا کسی اور دلیل سے یہ بات ثابت ہو جاوے کہ واقع میں کوئی ہمارا صانع ہے اور مرنے کے بعد ہم کو اپنی بُرائی بھلائی کا ثمرہ ضرور ملنے والا ہے تو بیشک ہم کو ان دونوں باتوں کا تفصیلی علم حاصل کرنے کے لئے اپنی عقل ناقص کے سوا کوئی اور ذریعہ ڈھونڈنا پڑیگا اور وہ ذریعہ نہیں ہے مگر وجود صاحب الہام والحمد للہ علی الاتمام۔

زمانہ

جب زمانہ بدلے تم بھی بدل جاؤ

زمانہ کی نیرنگیاں مشہور اور اُس کی تلون مزاجیاں ضرب المثل ہیں وہ سدا ایک حال پر نہیں رہتا وہ ہمیشہ ایک چال پر نہیں چلتا۔ وہ گرگٹ کی طرح برابر رنگ بدلتا رہتا ہے وہ اُس پتھر کی طرح جو پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکا یا جائے ہزاروں پلٹے کھاتا چلا جائے۔ وہ جو روپ بھرتا ہے اُسکے چہرہ پر کھل جاتا ہے وہ جو ٹھاٹھ بدلتا ہے اس کا رنگ ساری مجلس پر چلا جاتا ہے وہ کبھی دن کی روشنی میں اور کبھی رات کی تاریکی میں۔ کبھی گرمی کی تپش میں اور کبھی جاڑے کی ٹھر میں ظہور کرتا ہے پر کسی بھیس میں اس کا رنگ جمے بغیر نہیں رہتا جب وہ دن کا بانا بدلتا ہے تو رات کے سارے عمل باطل کر دیتا ہے سوتوں کو نیند سے جگاتا ہے نکموں کو کام پر لگاتا ہے طبیعتوں سے سستی کو دور کرتا ہے اور دلوں کو اُمنگوں سے بھر دیتا ہے۔ جب وہ رات کا برقع پہنتا ہے۔ تو دن کی ساری کائنات حرف غلط کی طرح مٹا دیتا ہے۔ تردوروں کا دل محنت سے اچاٹ کرتا ہے جفاکشوں کو بستر راحت کی طرف کھینچکر

لاتا ہے اور ساری دنیا پر غفلت کا پردہ ڈالدیتا ہے گرمی میں اُس کی بازی کا نقشہ کچھ اور ہے اور جاڑے میں اُس کی حکومت کا ڈھنگ کچھ اور ہے۔ مبارک وہ ہیں جنہوں نے اُس کے تیور پہچانے اور اُس کی چال ڈھال کو نگاہ میں رکھا۔ جدھر کو وہ چلا اُس کے ساتھ ہو گئے۔ اور جدھر سے اُس نے رُخ پھیرا اُس سے پھر گئے +

جس طرح دنیا کی بہبودی کا مدار مقتضائے وقت کی موافقت پر ہے اسی طرح دین کی کامیابی بھی اسی پر موقوف ہے۔ کتاب مقدس توریت میں خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بڑی تعریف اس بات پر کی ہے کہ وہ مصریوں کے تمام علوم میں کامل تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ نبوت جیسا جلیل القدر منصب بھی اُسی شخص کو عطا ہوتا ہے جس میں زمانہ کے حسب حال ہونیکی پوری پوری قابلیت ہوتی ہے +

ہمارے نبی برحق نے جو دعوت اسلام میں کامیابی نمایاں حاصل کی اُس کا بڑا ذریعہ عبارات قرآنی کی سلاست اور بلاغت تھی جس کا مدار بالکل مقتضائے وقت کی موافقت پر تھا کیونکہ اس وقت شعر و شاعری کے شور سے تمام عرب گونج رہا تھا اور فصاحت و بلاغت کے دعوے نہایت توجہ سے سُنے جاتے تھے کوئی کمال علم ادب کے ہم پلہ نہ سمجھا جاتا تھا۔ اور کوئی ہتیار تیغ زبان کے برابر کارگر نہ ہوتا تھا +

آنحضرت صلعم کے بعد پہلی اور دوسری خلافت میں جو اسلام کو ترقی روز افزوں نصیب ہوئی اور کوئی فتنہ ایسا حادث نہ ہوا جو اس کے زور و طاقت کی مزاحمت کرتا اس کا اصل سبب اُس کے سوا کچھ نہ تھا کہ منصب خلافت کے لئے آگے پیچھے ایسے دو شخص انتخاب کئے گئے جن کا چلن اور برتاؤ بالکل مقتضائے وقت کے موافق تھا اور اس سبب سے زمانہ اُن کا معین و مددگار بن گیا تھا چنانچہ اسی مصلحت کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب مرتضوی کے استخلاف کی نسبت والی کلا ادا کر دعوت فرمایا اور شیخین کی نسبت کچھ تردد ظاہر نہ کیا +

فاروق کی شدت چونکہ مقتضائے وقت کے موافق تھی اس لئے مزرعہ اسلام کے حق میں ابر رحمت کا کام کر گئی اور عثمان ذوالنورین کی مروت جو انہوں نے مروان بن الحکم وغیرہ کے ساتھ برتی چونکہ مقتضائے وقت کے موافق نہ تھی اس لئے اس فتنہ عظیم کی اصل قرار دی گئی جو آپکے آخر عہد خلافت میں ہوا اور جس کا ایک نتیجہ آپ کا قتل تھا +

ایک زمانہ میں مقتضائے وقت یہ تھا کہ محدثین اسلام۔ اس خیال سے کہ رسول مقبول کے ارشادات

تمام و کمال فراہم ہو جائیں) روایات کے اخذ کرنے میں رطب و یابس کی کچھ تمیز نہ کرتے تھے۔ پھر دوسرے زمانہ کا مقتضیٰ یہ ہوا کہ ان روایتوں کی تنقید اور ان کے راویوں کی چھان بین کی جائے اور صحیح کو سقیم سے اور قوی کو ضعیف سے اور معروف کو منکر سے اور ثابت کو موضوع سے جدا کیا جائے اگر وہ پہلا طبقہ مقتضائے وقت کا لحاظ نہ کرتا تو علم نبی کا ایک بڑا حصہ ضائع ہو جاتا اور اگر یہ دوسرا گروہ کھڑا نہ ہوتا تو حق و باطل اور صدق و کذب کا امتیاز دشوار ہو جاتا۔

بڑی دلیل اس بات کی کہ مقتضائے وقت کا لحاظ ضروریات سے ہے جس کو مسلم نے ابی ہریرہ رضہ سے اور (اس کے قریب قریب) محب طبری نے ابو موسیٰ الاشعری سے روایت کیا ہے۔ اس روایت کا ماحصل یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ جو شخص صدق دل سے لا الٰہ الا اللہ کہیگا وہ ضرور بخشا جائیگا۔ عمر فاروق یہ مضمون سنکر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اس بشارت سے لوگ اعمال صالحہ کی بجا آوری میں قصور کرینگے۔ آپنے فاروق اعظم کی اس رائے کو پسند فرمایا اور تاوقتیکہ روایات کی تدوین کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ یہ بشارت تمام امت میں عام نہ ہوئی۔

الغرض دنیا کی بہبودی یا دین کی کامیابی مقتضائے وقت کی موافقت بغیر حاصل نہیں ہو سکتی مگر اس موافقت سے ہماری یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ مثلاً بیدینی و الحاد کے زمانہ میں دین و مذہب سے ہاتھ اٹھا بیٹھیں اور عیش و عشرت کے زمانہ میں جفاکشی اور محنت سے دست بردار ہو جائیں یا جہاں خوشامد کا بازار گرم ہو وہاں خوشامدی بن جائیں اور جہاں مسخرہ پن کا زور ہو وہاں غیرت اور حمیت کو بالائے طاق رکھدیں نہیں۔ بلکہ ہماری رائے میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا زمانہ ایسا نہیں ہوتا جس میں مقتضائے وقت کے موافق کوئی نہ کوئی جائز طریقہ کامیابی کا موجود نہ ہو۔ مثلاً جب فلسفۂ یونانیہ یونانی زبان سے عربی زبان میں منتقل ہوا اور بطلیموس و ارسطو کے خیالات عرب اور عجم کے گلی کوچوں میں منتشر ہو گئے تو الحاد اور بیدینی نے لوگوں کے دلوں میں چٹکیاں لینی شروع کیں یہاں تک کہ نصوص قرآنی اور احادیث نبوی پر دھڑا دھڑ اعتراض ہونے لگے اور جا بجا دین میں رخنے نکلنے لگے اس وقت علما کے فروغ اور کامیابی کے دو طریقے پائے جاتے تھے۔ ایک ناجائز دوسرا جائز۔ ناجائز طریقہ یہ تھا کہ مسائل فلسفیہ کی تائید کر کے الحاد کی آگ کو اور مشتعل کر دیتے اور زاہدی جیسی من بھاتی چیز کو دنیا میں پھیلا کر دنیوی فروغ حاصل کرتے اور جائز یہ تھا کہ شریعت اور حکمت میں تطبیق یا مسائل حکمیہ کی تغلیط کر کے الحاد کی آنچ سے دین کو بچاتے اور معترضوں کی زبان بند کرتے چنانچہ علمائے اسلام

نے (شکر اللہ سعیہم) یہی جائز طریقہ اختیار کیا اور فلسفہ یونانیہ کے مقابلہ میں ایک جدا فلسفہ قائم کیا جو اہل اسلام میں علم کلام کے نام سے مشہور ہے +

وہ لوگ زمانہ کے ساتھ پھر گئے۔ گرمی میں گرمی کا سامان کیا۔ اور جاڑے میں جاڑے کی تیاری کی۔ دن کو دن کی طرح بسر کیا۔ اور رات کو رات کے طور پر کاٹا۔ اور بدنصیب وہ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی سے جی چرایا۔ اور اس کی ہمراہی سے ناک چڑھائی۔ گرمی چمکی پر انھوں نے جاڑے کے کپڑے نہ اتارے اور ہلکے پھلکے نہ بنے۔ دن نکلا پر انہوں نے کروٹ نہ بدلی اور خواب شبینہ سے بیدار نہ ہوئے اب وہ بہت جلد دیکھینگے کہ پیچھے کون رہا اور منزل تک کون پہنچا +

جو لوگ زمانہ کی پیروی نہیں کرتے وہ گویا زمانہ کو اپنا پیرو بنانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ اُن کی سخت خام خیالی ہے۔ چند مچھلیاں دریا کے بہاؤ کو نہیں روک سکتیں۔ اور چند جھاڑ یاں ہوا کا رخ نہیں پھیر سکتیں۔ اسی لئے ایک پختہ کار شاعر نے کہا ہے کہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" اور عرب کے ایک حکیم کا قول ہے کہ دُر مع الدھر کیف ما دار۔ (یعنی زمانہ جدھر کو پھرے اس کے ساتھ پھر جا) شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ سرالہیولے لکل صورۃ (یعنی اپنی ذات میں ایسی قابلیت پیدا کر کہ جس رنگ کو چاہے فوراً قبول کرلے) یہ اس لئے فرمایا ہے کہ زمانہ کبھی انقلاب سے خالی نہیں رہتا اور اُس کا مقابلہ انسان ضعیف البنیان سے نہیں ہو سکتا۔ پس انسان میں ایسی قابلیت ہونی ضرور ہے کہ جیسی ضرورت دیکھے ویسا بن جائے تاکہ زمانہ کا کوئی انقلاب اس کو سخت صدمہ نہ پہنچائے۔ آندھی کے بُرے حملے اُنہیں تناور درختوں کو نقصان پہنچاتے ہیں جو اپنی جگہ سے ٹلنا نہیں چاہتے پر چھوٹے چھوٹے لچکدار پودے جو ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ جھک جاتے ہیں ہمیشہ برقرار رہتے ہیں +

اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عارضی یا چند روزہ کامیابی مقتضائے وقت کی مخالفت میں بھی حاصل ہو سکتی ہے مگر جو لوگ دنیا میں آکر کامیابی کا پورا پورا استحقاق حاصل کر گئے وہ وہی تھے جنہوں نے مقتضائے وقت کو ہاتھ سے نہ دیا اور جیسا زمانہ دیکھا ویسے بن گئے +

حکیم اوحد الدین الوذری جس نے اپنے زمانہ کے تمام علوم میں کامل دستگاہ حاصل کی تھی۔ اور پھر عجم کے اُن تین شاعروں میں شمار کیا گیا جو پیغمبر شعر مانے گئے ہیں۔ اگر مقتضائے وقت کی پیروی نہ کرتا تو یہ شہرت اور عزت اس کو ہرگز حاصل نہ ہوتی وہ خراسان کی ایسی بستی (زنکان) میں ٹھیرا ہوا تھا کہ اتفاق سے اُس عہد کے ملک الشعرا ابو الفرج سنجری کا لشکر بھی وہیں آکر ٹھیرا۔ الوذری نے دریافت کیا تو معلوم

ہؤا کہ یہ سارا جلوس سنجری کے ساتھ ہے۔ کہا سبحان اللہ علم کا مرتبہ ایسا بلند اور میں اس قدر مفلس! اور شاعری کا درجہ ایسا ذلیل۔ اور اس شخص کو یہ جاہ و حشمت؟ اب مجھ کو بھی قسم ہے جو شاعری بنکر دکھاؤں۔ چنانچہ اسی رات کو ایک قصیدہ سلطان سنجر کی مدح میں لکھکر تمام کیا جس کا مطلع یہ ہے ؎

گر دل و دست بحر و کان باشد — دل و دست خدائیگاں باشد

پھر تمام عمر شاعری کی بدولت خوشحال اور فارغ البال رہا اور دنیا میں شہرت اور بلند نامی حاصل کی۔

ایک مجلس میں شیخ ابو الفضل کے کمالات اور ترقیات کا تذکرہ تھا ایک صاحب بولے کہ "وہ باوجود ان کمالات اگر اس زمانہ یعنی انیسویں صدی عیسوی میں ہوتا تو شاید عدالتوں میں عرضی نویسی کر کے اپنا پیٹ پالتا"۔ ہم نے کہا "اگر وہ اس زمانہ میں ہوتا تو ہرگز اپنی کامیابی کا ذریعہ اس لیاقت کو نہ گردانتا جس کی بدولت اس نے سولھویں صدی عیسوی میں ترقیات حاصل کی تھیں۔ بلکہ اس عہد میں وہ کم سے کم ایم اے یا ایل ایل ڈی کا درجہ ضرور حاصل کرتا اور کچھ نہیں تو لندن کے کسی نامی گرامی اخبار کا کاریسپانڈنٹ ضرور ہوتا"۔ یہ ہمارا ایک سرسری جواب تھا۔ جو اس وقت بلا تامل زبان سے نکل گیا مگر اب غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جواب بالکل صحیح تھا۔ ابو الفضل کی ذات میں ہر زمانہ کا رنگ بدلنے کی ایسی قابلیت تھی کہ وہ جس زمانہ میں ہوتا اس زمانہ کی حیثیت کے موافق ضرور اپنے ہم چشموں میں ممتاز ہوتا۔

وہ ایک رقعہ میں جو غالباً اس نے اپنے باپ کے نام لکھا ہے تحریر کرتا ہے کہ "بعض لوگ میری نسبت یہ کہتے ہیں کہ ایک طالب علم کو اس قدر منصب جلیل تک پہنچا دینا بادشاہ کو زیبا نہ تھا اس لئے میری بھی یہی تمنا ہے کہ سپہ گری کا کوئی کارنمایاں دکھاؤں"۔ اس کا یہ قول نرا دعوے ہی دعوے نہ تھا بلکہ اس کے مرتے وقت اس کے اکثر ہمراہی بھاگ گئے تھے۔ اور چند آدمی جو بچے تھے وہ اس کو یہ صلاح دے رہے تھے۔ کہ اس تھوڑی سی جمعیت پر بندیلے کا مقابلہ کرنا مصلحت نہیں مگر وہ نہایت ترشی سے یہ کہکر کہ "مگر گریزم"۔ اکیلا فوج مخالف میں جا گھسا۔ لیکن چونکہ پیمانہ عمر لبریز ہو چکا تھا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا اور اس کے گرتے ہی مخالفوں نے تیغ کا کام تمام کر دیا۔

سلطان شہاب الدین غوری کو مؤرخوں نے بہت سخت اور تند مزاج لکھا ہے اور اس کے ثبوت کے لئے اس کی وہ زیادتی پیش کرتے ہیں۔ جو فتح اجمیر کے بعد اس سے ظہور میں آئی۔ یعنی کئی ہزار آدمی جو فتح کے بعد بچ رہے تھے ان سب کو تیغ بیدریغ کے حوالہ کیا۔ مگر باوجود اس کے اس کی سختی اور تند مزاجی کو اس سبب سے مذموم نہیں سمجھا کہ جس فتنہ و فساد کے زمانہ میں وہ متسلط ہؤا تھا اس کے لئے ایسے ہی مزاج کا بادشاہ ہونا سزاوار تھا۔

جلال الدین اکبر کا زمانہ (جیسا کہ اکثر مورخوں نے لکھا ہے) ظاہرا بیدینی اور الحاد کا زمانہ ثابت ہوتا ہے اور اس سبب سے ممکن ہے۔ کہ بہت سے لوگوں کی کامیابی کا ذریعہ بھی بیدینی اور الحاد ہو۔ مگر تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے عہد میں کامیابی کا بڑا ذریعہ شجاعت و بہادری یا فضل و کمال اور علم و ہنر تھا۔ کیونکہ اُس کے درباریوں اور مقربوں میں کوئی آدمی ایسا نہیں معلوم ہوتا تھا جس نے بدون کسی کمال یا ہنر کے محض بیدینی اور الحاد کے ذریعہ سے معتد بہ امتیاز حاصل کیا ہو بلکہ اُس کے ارکان دولت میں ایسے آدمی البتہ پائے جاتے ہیں جو اپنے مذہبی قواعد کے نہایت پابند تھے اور جنہوں نے صرف اپنے فضل و ہنر کی بدولت بادشاہ کے دل میں جگہ پائی تھی۔ جیسے ملا فتح اللہ شیرازی مسلمانوں میں۔ اور راجہ ٹوڈرمل ہندوؤں میں یہ دونوں شخص اکبری دورہ میں مذہب کے نہایت متعصب گنے جاتے تھے باایں ہمہ ملا نے اپنے علوم عقلیہ و نقلیہ کے سبب اور راجہ نے حساب سیاق کی مہارت سے یا دانشمندی اور حسن تدبیر کی جہت سے دربار بادشاہی میں جو مرتبہ حاصل کیا وہ سب پر روشن و ہویدا ہے ✤

بہر حال جہاں کامیابی کے دو چار ناجائز طریقے پائے جاتے ہیں۔ وہاں ایک دو طریقے جائز بھی ضرور موجود ہوتے ہیں۔ اور جو کامیابی اُن ناجائز طریقوں سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ اُس کامیابی کے برابر کبھی پائیدار و مستحکم نہیں ہوتی۔ جو جائز طریقوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم نے بارہا تجربہ کیا ہے۔ کہ جن درباروں میں مثلاً خوشامد کا بازار گرم تھا۔ اور جہاں حاکم کی مرضی کے خلاف بولنا جرائم کبیرہ کے ارتکاب سے زیادہ خطرناک سمجھا جاتا تھا جب وہاں کوئی سچا اور آزاد طبیعت کا آدمی پہنچا اگرچہ اُس کو چندروز اپنی آزاد طبیعت کی کسی قدر روک تھام کرنی پڑی لیکن آخر اُس کی راستی اپنا رنگ جمائے بغیر نہ رہی۔ رفتہ رفتہ اُسی کا قول معتبر ٹھہرا اور اسی کی صلاح نیک سمجھی گئی ✤

ان تمام شہادتوں سے ہم بآسانی یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ہندوستان کی اکثر قومیں جو روز بروز با اقبال ہوتی جاتی ہیں۔ اور مسلمانوں کی قوم بد اقبالی کے بھنور اور ذلت کی دلدل سے کسی طرح نہیں نکلتی اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں۔ کہ اور لوگ اپنی حالت کو زمانہ کے موافق بناتے جاتے ہیں پر مسلمان اپنی وضعداری کو ہاتھ سے نہیں دیتے ✤

اے ہندوستان کے مسلمانو۔ کیا تم ابھی اُس عالم میں ہو۔ جس میں تمہارے آباؤ اجداد

زندگی بسر کر گئے ہیں؟ کیا تم اُسی کھیتی کے پروان چڑھنے کے منتظر ہو جس میں تمہارے بزرگوں نے تخم افشانی کی تھی! مدت ہوئی کہ وہ عالم گذر گیا۔ اور وہ کھیتی دریا برد ہوئی۔ ذرا آنکھیں کھولو اور دیکھو کہ تم کون ہو اور کہاں ہو۔ تمہاری گرہ میں جو دام ہیں وہ بازار میں آج پھوٹی کوڑی کو نہیں چلتے۔ تمہاری دوکان میں جو مال ہے اُسے کوئی مفت خرید نا نہیں چاہتا۔ تمہارے چراغ میں جو تیل تھا وہ جل گیا۔ تمہاری کھیتی میں جو پانی تھا وہ سوکھ گیا۔ دیکھو! تمہاری ناؤ بودی ہے۔ اور دریا دم بدم چڑھتا جاتا ہے۔ تمہارا قافلہ پیادہ ہے اور منزلیں کٹھن آتی جاتی ہیں ÷

اس تمہید سے ناظرین کو ضرور یہ خیال پیدا ہو گا۔ کہ ہم آگے چلکر اپنی قوم کو انگریزی پڑھنے کی۔ میز کرسی لگانے کی۔ کوٹ پتلون پہننے کی۔ چھری کانٹے سے کھانے کی ترغیب دینگے کیونکہ ظاہر از مانہ کا حال مقتضی یہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر اُن کو یاد رہے۔ کہ ہماری مراد اس تمہید سے یہ ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ وہ جس بُری حالت میں ہیں۔ اُس سے نکلنے کی جو سیدھی راہ اُنہیں نظر آئے اُسی راہ کو اختیار کریں۔ اور جس طرح ہو سکے اپنا قدم آگے بڑھائیں۔ کیونکہ زمانہ باآواز بلند کہہ رہا ہے۔ کہ من استوا یوماہ فھو مغبون۔ (یعنی جس کے دو دن ایک حالت پر گذرے وہ خسارہ میں رہا) اور در و دیوار سے یہ صدا آرہی ہے کہ۔ قدم سعی پیشتر بہتر ÷

دنیا میں آج کل ایک عام گھوڑ دوڑ کا تماشا ہو رہا ہے۔ ہر گروہ کے شہسوار جوق جوق اس میں آتے ہیں۔ اور اپنے اپنے ہنر دکھاتے جاتے ہیں۔ کچھ اُن میں سے گھر دم آتے ہی برق خاطف کی طرح ایک آن واحد میں گذر گئے۔ کچھ اُن سے پیچھے پہنچے۔ کچھ راہ میں ہیں۔ مگر افتاں و خیزاں چلے جاتے ہیں۔ کتنوں نے اپنے گھوڑوں کی ابھی باگ اٹھائی ہے کتنے چلنے کی تیاری کر رہے ہیں لیکن بہتروں کو ابھی گھوڑ دوڑ کی خبر بھی نہیں پہنچی۔ اُن کے گھوڑے تھان پہ بندھے ہیں۔ اور وہ خود آرام سے پڑے سوتے ہیں۔ شاید وہ اُس وقت بیدار ہونگے۔ جب گھوڑ دوڑ کا وقت نکلجائے گا۔ اور وہ ہاتھ ملتے رہ جاوینگے۔

اے مسلمانوں ہم کو خوف ہے۔ کہ وہ ناکام گروہ کہیں تمہاری ہی قوم نہ ہو۔ اور وہ ہاتھ جو ملے جائینگے۔ تمہارے ہی ہاتھ نہ ہوں ÷

اے مسلمانوں تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ جو شے تم کو اُبھرنے نہیں دیتی وہ کیا ہے؟ اور جس

کے سبب تم جنبش نہیں کر سکتے۔ وہ کون سی بندش ہے؟ یاد رکھو وہ تمہاری بیہودہ تقلید ہے۔ جس نے تم کو مذہبی امور ہی میں مجبور اور بے اختیار نہیں کیا بلکہ تجارت میں، زراعت میں، علم و ہنر میں، حرفہ اور پیشہ میں۔ غرض ہر کام میں تمہاری عقلوں پر پردہ اور ہر راہ میں تمہارے پاؤں میں بیڑی ڈال رکھی ہے۔ اور تم کو اُس پرند جانور کی طرح بے بس کر رکھا ہے۔ جس کے پر کٹے ہیں۔ اور آنکھیں سی ہوئی ہوں۔ نہ تم میں طاقت پرواز ہے نہ نگاہ دوربین ہے۔ تقلید نے تم کو تمام دینی اور دنیوی ترقیوں سے فارغ البال کر رکھا ہے۔ اور تمہارے کان میں یہ پھونک دیا ہے کہ جو کچھ کرنا تھا سو اگلے کر گئے۔ اب اُس سے زیادہ کرنا غیر ممکن ہے۔ تمہارے نزدیک جس قطع کی کشتی طوفان نوح میں بنائی گئی تھی اُس سے بہتر کوئی قطع انسان کے ذہن میں نہیں آسکتی۔ اور جو پیشہ آج سے ہزار برس پہلے تمہارے بزرگوں نے اختیار کیا تھا اس کے سوا کسی حیلہ سے تم روٹی نہیں کما سکتے۔ تمہارے نزدیک تمام عقل انسانی پہلے طبقوں پر تقسیم ہو گئی۔ اور انہوں نے تمہارے لئے کوئی موقع ایسا نہیں چھوڑا جس میں تم کو اپنی انسانیت سے کچھ کام لینے کی ضرورت پڑے۔ شیخ نے قانون میں بدن انسان کی تشریح جو لکھدی سو لکھدی۔ اور محمد حسین دکنی برہان قاطع میں لغات فارسی کی تحقیق جو کر گیا سو کر گیا۔ اب کون ہے جو قانون سے بڑھکر لکھ سکے۔ یا برہان میں کوئی عیب نکال سکے۔ تم صرف اُنہیں لوگوں کی تقلید نہیں کرتے۔ جن کے ساتھ تم کو حسن عقیدت ہے بلکہ طب میں جالینوس کی منطق میں ارسطو کی ہندوستان کی رسموں میں ہندوؤں کی تقلید کو بھی اسی قدر ضروری جانتے ہو۔ جس قدر مذہب امام اعظم رہ کی تقلید تمہارے نزدیک واجب و لازم ہے۔ اگر کسی کو اس بات میں تامل ہو تو نکاح بیوگان کے معاملہ میں غور کرے اور دیکھے کہ اُس کا مجوز کون ہے اور مانع کون ہے۔ اور ہندوستان کے عام مسلمانوں نے مجوز کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ یا مانع کا کہنا مانا ہے۔

اس تقلید کی بدولت تم میں ایک اور مرض پیدا ہو گیا ہے۔ جس نے تمہاری رہی سہی ہمت خاک میں ملا دی۔ اور تم کو بالکل اپاہج کر دیا۔ پوچھو وہ کیا ہے؟ وہ خانہ خراب وضعداری ہے۔ جس کی ہدایت سے تم ترقی کرنے والوں کو متلون المزاج سمجھتے ہو۔ اور ڈھور ڈانگروں کی طرح سدا ایک حالت پر رہنے کو کمال نفس انسانی قرار دیتے ہو۔

ہندوستان کے وضعداروں کی یہ رائے ہے۔ کہ آدمی اپنی زندگی میں جو طریقہ یا جو عادت اختیار کرے۔ اُس کو آخر عمر تک ترک کرنا نہیں چاہئے۔ جوانی میں اگر ڈاڑھی چڑھانے کی عادت ہو جاوے۔ تو سن شیخوخت تک اس وضع کو نباہنا ضرور ہے۔ اور بچپن میں اگر کامدار ٹوپی پہننے کا چسکا پڑ جائے۔ تو بڑھاپے کے جھریائے چہرہ کو بھی اس سے محروم رکھنا نہیں چاہئے۔ چنانچہ معتبر راویوں سے سُنا گیا ہے۔ کہ دو بزرگوار نجف خانی جن کا سن شریف ساٹھ پینسٹھ سے تجاوز ہو گیا تھا۔ اور نہایت متقی اور متورع آدمی تھے۔ ہر جمعہ کو شاہ عبدالعزیز صاحب کے درس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ شاہ صاحب بھی اُن کی کمال تعظیم کرتے تھے۔ باایں ہمہ تقدس دونوں حضرات ڈاڑھی گھٹواتے تھے۔ بعضے منہ پھٹ آدمیوں نے جو اُن پر اعتراض کیا تو یہ فرمایا کہ ہم خود اس حرکت سے منفعل ہیں۔ مگر کیا کریں۔ جو وضع قدیم سے چلی آتی ہے۔ اُس کے خلاف کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اسی طرح ایک شریفوں کی بستی میں ایک صاحب سن رسیدہ بڑے نمازی اور پرہیزگار تھے۔ مگر عشا کی نماز کبھی نہ پڑھتے تھے۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو یہ فرمایا کہ بچپن میں تو اس سبب سے نہ پڑھی کہ کھانا کھاتے ہی شام سے سو رہتے تھے۔ جوانی میں لہو و لعب مانع رہا۔ اب بڑھاپے میں نئی بات کرتے ہوئے جی ہچکچاتا ہے۔ خیر ہم اپنے قدما کی اِس رائے پر اعتراض نہیں کرتے۔ کیونکہ اُس وقت زمانہ کا مقتضا یہی تھا۔ سلطنت مغلیہ پر زوال آچکا تھا۔ ترقی کی راہیں فتنہ و فساد کے سبب چاروں طرف سے مسدود تھیں۔ طبیعتوں پر مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی ایسے وقت میں تنزل کے جس قدر آثار مسلمانوں میں پائے جاتے تھوڑے تھے۔ مگر ہم کو اپنے ہمعصروں کے حال پر بے اختیار رونا آتا ہے۔ جو اس امن و آزادی کے زمانہ میں بھی وضعداری کے حصار سے باہر نہیں نکلتے اور مقتضائے وقت کو نہیں دیکھتے۔ نہ آپ ترقی کرنی چاہتے ہیں۔ نہ اوروں کی ترقی کو پسند کرتے ہیں۔ جو شخص اپنی پست حالت سے نکلکر اچھی حالت میں آنا چاہتا ہے۔ اُس کو تنا متلوّن مزاج اور بے استقلال ہی نہیں بناتے۔ بلکہ اُس پر انواع و اقسام کی رائیں لگاتے ہیں۔ جن میں سب سے ہلکی الحاد کی پیشین گوئی ہے۔

شائستہ ملکوں میں آجکل ترقی کی یہ صورت ہے کہ جو شخص پانچ سات برس کہیں

پردیس میں رہ آتا ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتا۔ کہ وطن میں پہنچکر اسی وقت وہاں کی عام مجلسوں میں شریک ہوجائے۔ جتنے دنوں وہ باہر رہتا ہے۔ اتنی مدت میں وہاں اس قدر ترقی ہوجاتی ہے۔ کہ یہ وہاں پہنچکر ایک دوسرا عالم دیکھتا ہے اور اپنے تئیں اس شعر کا مصداق پاتا ہے۔ ؎

عبارت کوتہ و دل تنگ و خاصان ملک زیبا
چہ داند مرد صحرائی طریقِ کار سازی را

سچ یہ ہے۔ کہ آیۂ کل یوم ھو فی شان کے معنے ایسے ہی ملکوں میں جاکر کھلتے ہیں۔ اور انسان کا اشرف المخلوقات اور خلیفۃ الرحمٰن ہونا وہیں جاکر ثابت ہوتا ہے۔ نہ کہ ہندوستان میں اور خاصکر ہمارے بھائی مسلمانوں میں جن کی حالت کو دیکھکر خدا تعالےٰ کی قدرت اور اس کی فیاضی ایک خاص حد تک محدود معلوم ہوتی ہے۔ اور اس آیت کے معنے صرف اعتقاداً تسلیم کرنے پڑتے ہیں۔ کہ "ولقد کرمنا بنی آدم وحملنٰھم فی البر والبحر ورزقنٰھم من الطیبات وفضلنٰھم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلاً" بارخدایا ہماری قوم کو تقلید بیجا اور وضعداری بے سرو پا سے نجات دے اور اُن کو دینی و دنیوی ترقیات پر آمادہ کر۔ ان کا ادب اُن کو قدما سے آگے بڑھنے نہیں دیتا۔ اور اُن کی وضعداری پستی سے بلندی کی طرف نہیں جانے دیتی۔ کاش بیہ بے ادب اور متلون مزاج بھی بن کر قدم آگے بڑھائیں۔ اور اُس جوہر قابل کی قدر پہچانیں۔ جو تو نے بنی نوع انسان کے تمام اگلے اور پچھلے طبقوں کو یکساں عنایت کیا ہے۔ ؎

سر روحانیاں داری ولے خود را نہ دیدستی
بخواب خود درآ تا قبلۂ روحانیاں بینی

مضمون فارقلیط اللہ

مباحثہ

نئی تہذیب اور پرانے خیالات کا

ایک دوست ایک اپنے قدیم دوست پاس آئے، اور دیکھا کہ وہ قدیم دوست کسی قدر نئی تہذیب میں ہیں۔ کچھ دل میں آزردہ ہوئے۔ اور کہا کہ آجکل ہندوستان میں تہذیب کی کچھ بڑی دھوم دھام ہے کوئی کہتا ہے کہ پتلون پہننا اور چھری کانٹے سے کھانا میز کرسی پر بیٹھنا بہت بڑی تہذیب ہے اور بہت لوگ کہتے ہیں۔ کہ یہ سب باتیں دین اسلام کے برخلاف ہیں اپنے بزرگوں کے دستوروں کو چھوڑنا بہت بری بات ہے۔ پھر فرمایئے تو کہ آپ کس رنگ میں ہیں +

جواب۔ آپ نے اخلاق ناصری اور اخلاق جلالی ضرور ملاحظہ کی ہوگی۔ اُس زمانہ میں علمائے اسلام نے حکمائے یونان کے اقوال کو نہایت اچھا سمجھا تھا۔ اور اُن کو اختیار کیا تھا۔ اور جبکہ حکمائے یورپ کے اقوال اُن سے بھی عمدہ ہیں اس لئے اس زمانہ کے مسلمانوں کو لازم ہے کہ یورپ کے حکماء کے اقوال کی عزت کریں +

سوال۔ آپ نے تہذیب کے کیا معنے سمجھے ہیں +

جواب۔ وہی جو اخلاق جلالی اور اخلاق ناصری میں لکھے ہیں یعنی سیاست نفس۔ سیاست منزل۔ سیاست مدن۔ مگر اتنا فرق ہے کہ اُس زمانہ کے لوگوں نے لکھا پر کیا کچھ نہیں یورپ کی قوموں نے ان تینوں باتوں کو بدرجہ کمال پہنچادیا +

سوال۔ کیا تہذیب انگریزی بوٹ اور کالا کوٹ ہی پہننے میں ہے جس پر لوگ ہنستے ہیں اور برا کہتے ہیں +

جواب۔ ہنسنا تو ایک حماقت کی بات ہے۔ مگر سمجھنا چاہئے کہ ہر ایک چیز کی جُدا جُدا تہذیب ہے لباس اور روزمرہ کے دستورات کی تہذیب بمنزلہ الف بے کے ہے اگر یہ شروع نہ ہو تو سبق تہذیب کا آگے چل نہیں سکتا۔

ہمنے جو یہ کہا کہ ہر ایک چیز کی جدا تہذیب ہے۔ اس کی تمثیلیں سنو۔ ہندوستان میں پہلے سب آدمی مٹی کے چراغ میں تیل ڈالکر طاق میں رکھتے تھے جس سے طاق چکنا اور دیوار کالی ہوتی تھی۔ ہزاروں پتنگے اُس میں چمٹکر رہ جاتے تھے۔ اُس میں تہذیب ہوئی اور لکڑی کا دیوٹ بنایا گیا طاق کا چکنا ہونا اور دیوار کا کالا ہونا تو موقوف ہوا۔ مگر دیوٹ ایک ایسی بیڈول چیز تھی جس پر سیروں چیکٹ جم جاتا تھا ہزاروں جانور چمٹ چمٹ کر مرجاتے تھے۔ جب اٹھا کر دوسری جگہلے جاؤ تو ہاتھ کالا اور چکنا ہو جاتا تھا۔ پھر اُس میں بھی تہذیب ہوئی کہ پیتل کا ڈیوٹ بنایا اور فتیل سوز اس کا نام رکھا۔ اُس میں بھی وہ سب نقص تو رہے مگر اتنا ہوا۔ کہ آٹھویں دسویں روز سلیقہ والے گھروں میں بھوبل ڈالکر اور مانجھ کر صاف کر لیتے تھے۔ اب حکما و یورپ نے اُس کی اور زیادہ تہذیب کی۔ لمٹپ نکالا جس کا تیل سب چھپا ہوا ہے ایک کل کے ہلانے سے بتی اوپر تلے چڑھ اُتر آتی ہے۔ پھر روشنی کی چیز میں ترقی کی کراسین کا تیل نکالا جس میں مطلق چکنائی نہیں پھر اُس سے بھی بڑھ کر گاس نکالی۔ کہ وہ صرف ایک ایسی ہوا ہے جو نظر بھی آتی ہے۔ مگر نہایت عمدہ بغیر تیل بتی کے جلتی ہے۔ اور اب ایک اور قسم کی روشنی نکلتی ہے۔ جو اِن سب سے بڑھ کر ہے۔ پس یہ تمام درجے جو ہمنے بتلائے چراغ کی تہذیب کے تھے۔ اگر ہمارے ملک کے لوگوں سے کہا جاتا کہ چراغ میں تہذیب کرو۔ تو وہ اپنی نادانی سے ہنستے اور کہتے کہ چراغ میں کیا تہذیب ہوگی تہذیب کی باتیں تو اَور ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ بھی احمق ہیں جو یہ بات کہتے ہیں کہ لباس نشست برخاست میں۔ کھانے پینے میں کیا تہذیب ہے۔ تہذیب کی باتیں تو اَور ہیں۔

دیکھو ہندوستان میں بیٹھنے کی چیز پیڑھی تھی۔ کرسیاں اور کوچیں اُس کی تہذیب ہیں۔ چمڑے کی جامدانی تمام ہندوستان میں عمدہ چیز گنی جاتی تھی۔ اب چمڑے کے بکس اور انواع و اقسام کے پوٹ مینٹو اور بیگ اس کی تہذیب ہے۔ کاٹھ کے صندوق سب استعمال کرتے تھے۔ اُس کی تہذیب خانوں دار الماری ہے جس میں سب چیزیں علیحدہ علیحدہ احتیاط سے رہتی ہے۔

ہندوستان میں توڑہ دار بندوق اور اخیر کو پتھر کلا کے شیر بچہ تھے۔ اب دیکھئے کہ اُس کی تہذیب ہو کر کیسی کیسی عمدہ بندوقیں اور عجیب و غریب طپنچے ایجاد ہوئے ہیں آپ نے پیندی کی طرف سے بھرنیوالی بندوقیں دیکھیں۔ جن کا کارتوس خود آتا جاتا ہے اور چھوٹنے کے بعد خود گر پڑتا ہے اور بغیر چمک اور پٹاخہ لگائے چل جاتا ہے ✦

آپ ہندوستانی گاڑی اور بکہ ورتھ پر سوار ہوئے ہیں جس میں بھیجا تک ہل جاتا ہے اُس کی تہذیب بگھی و چرٹ ہے اور اس وقت ریل سب سے اعلےٰ اُن کی تہذیب کا درجہ ہے۔ پس اُن کا مہذب چیزوں کا استعمال تہذیب ہے یا مہذب چیزوں کا ✦

سوال بیشک اُن تہذیب یافتہ چیزوں کا استعمال تہذیب میں داخل ہے اور روز بروز تمام قوموں میں اور مسلمانوں میں اُن کا استعمال ہوتا جاتا ہے۔ مگر بوٹ اور کوٹ پتلون پہننا اور میز کرسی پر چھری کانٹے سے کھانا خاص انگریزوں کا دستور ہے۔ ہم کو اُن کی تقلید کرنی کیا ضرور ہے جناب پیغمبر خدا صلعم نے چھری کانٹے سے میز پر بیٹھکر نہیں کھایا علاوہ اس کے جو لوگ ایسا کرتے ہیں اُن کی نسبت علماء من تشبہ بقوم کی دلیل سے کفر کا فتوےٰ دیتے ہیں ✦

جواب۔ آپ نے تو بہت سی باتیں گڈمڈ کر دیں مگر سب کا الگ الگ جواب سنئے ✦ انگریز اس دلیل سے تو میز کرسی پر کانٹے چھری سے نہیں کھاتے۔ کہ حضرت عیسےٰ یا حواریّین نے اس طرح پر کھایا ہے۔ پھر آپ کیوں دنیاوی برتاؤ کی باتوں میں جناب رسول خدا صلعم کا ذکر لاتے ہیں جو حالت اور طریقہ زندگی اور گذر اوقات اور کھانے پینے کا جناب رسول خدا صلعم کا تھا وہ کسی کا ہے۔ جو کچھ چیزیں آپ کھاتے ہیں۔ اور پہنتے ہیں اور ڈوری سے کھنچے ہوئے پلنگ پر سوتے ہیں اور چار چار جھالر دار تکیہ اِدھر اُدھر ہوتے ہیں۔ اور دو دو گل تکیہ اُس پر طرہ دن رات پان بازی ہوتی ہے دو گوشتا پلاؤ نوش ہوتا ہے کبھی جناب رسول خدا صلعم نے بھی ایسا کیا ہے پس ایسی باتوں میں آں حضرت صلعم کا نام مبارک لیتے ہوئے ہم کو شرم کرنی چاہئے ہمارا منہ اس لائق نہیں ہے یہ سب امور دنیوی ہیں عقل و حکمت سے علاقہ رکھتے ہیں دین و مذہب سے اُن کو کچھ تعلق نہیں ہے۔ ہم کب کہتے ہیں کہ تم انگریزوں کی تقلید کرو بلکہ دنیاوی باتوں میں جو عقل کے نزدیک بہتر ہو اُس پر چلو ✦

آپ اور تمام ہندوستان کے لوگ انگریزوں کا بنایا ہوا کپڑا پہنتے ہیں کیونکہ وہ نہایت عمدہ

ہوتا ہے۔ لباس سے دو چیزیں متعلق ہیں۔ ایک کپڑے کی عمدگی جس کا لباس بنایا جاوے۔ دوسرے لباس کی قطع۔ پہلی بات کو تو آپ قبول کرتے ہیں۔ کہ انگریزی کپڑے سے بہتر کپڑا نہیں۔ مگر انگریزی لباس کی جو قطع ہے اُس سے بہتر کوئی قطع بھی نہیں۔ جس طرح کہ خدا تعالےٰ نے انسان کے بدن کو بنایا ہے۔ اُسی طرح انگریزی لباس کی قطع ہے۔ اور یہی سبب ہے۔ کہ انگریزی لباس ہر عضو کے موافق اور بدن میں ٹھیک و چست ہوتا ہے برخلاف ہندوستانی لباس کے کہ ایک اس کی قطع بھی اعضاء بدن کے موافق نہیں ہے۔ پس اس طرح پر لباس کی قطع کرنا بھی ایک صنعت ہے جس طرح کہ ہزاروں آدمی کپڑے کی صنعت کو پسند کرتے ہیں۔ اِسی طرح بہت سے آدمی قطع کی صنعت کو بھی پسند کرتے ہیں +

یہاں تک گفتگو ہوئی تھی کہ عجیب صاحب خانہ نے ایک کتاب اٹھالی اور کھولکر دکھایا کہ یہ تصویر سلطان عبد المجید خاں مرحوم قیصر روم کی ہے۔ اور یہ تصویر نکلس شہنشاہ روس کی ہے اب بتاؤ کہ ان دونوں کے لباس میں کیا فرق ہے۔ چند صفحہ الٹ کر سلطان عبد العزیز خان سلطان حال کی تصویر دکھائی۔ یہ تصویر اُس وقت کی تھی جب وہ لندن گئے تھے۔ پھر ایک ورق اُلٹ کر اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کی تصویر دکھائی۔ پھر عبد السلام پاشا مراکو کی تصویر دکھائی۔ کہ سب انگریزی قطع کا لباس کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہیں۔ اور کہا اب تمام مسلمانی ملکوں کے سرداروں اور امیروں نے یہی لباس اختیار کیا ہے۔ یہ سب کافر ہیں۔ نعوذ باللہ +

ایک اور صاحب[1] جو وہاں بیٹھے ہوئے چپکے چپکے باتیں سُن رہے تھے بول اُٹھے کہ صاحب جس حالت میں سلطان روم اور تمام مسلمان بادشاہ اور اُن کے اُمرا اور وزرا ایسا لباس پہنتے ہیں جہاں بڑے بڑے علماء بھی موجود ہیں۔ اور خود سلطانِ عادل کا مرتبہ مجتہد سے فائق ہے تو اب اس میں بحث کرنا محض فضول ہے +

سوال ۔ صاحب یہ سچ مگر کیا کیجئے ہندوستان کے مُلّا تو من تشبہ بقوم کا فتویٰ دیکر کافر بنائے دیتے ہیں +

جواب ۔ جناب یہ ملا نہیں ہیں۔ بلکہ کٹھ ملّاں ہیں یہ ترجمہ درمختار کا جس کو مولوی محمد احسن صاحب نے چھاپا ہے موجود ہے۔ حنفی مذہب میں یہ کتاب نہایت معتبر ہے اور اسی پر حنفی مذہب

[1] اس مباحثہ کے وقت سید احمد خاں کے کسی دوست کی رُوح وہاں حاضر تھی۔ وہ بول اُٹھی کہ اسی لئے یہ تقلید سلطانان سید احمد خاں نے بھی یہ لباس اختیار کیا ہے ۱۲ مہتمم +

کا مدار ہے۔ اس کی جلد اول صفحہ ۸۲۵ میں یہ عبارت لکھی ہے کہ در مشابہ ہونا اہل کتاب سے ہر چیز میں مکروہ نہیں مثلاً کھانا اور پینا اور دوسری ضروریات مدنی مسلمانوں اور اہل کتاب کی یکساں ہیں تو مشابہت سے کچھ ہرج نہیں بلکہ بُری بات میں مشابہت مکروہ ہے" علاوہ اس کے احادیث شریف میں بھی آیا ہے۔ کہ جناب پیغمبر صلعم نے اور ملکوں کا لباس پہنا ہے۔ یعنی جُبّہ شامیہ اور جُبّہ رومیہ اور کسروانیہ اور قبلۂ فروج جس کا پیچھے سے دامن چاک تھا زیب تن مبارک فرمایا ہے۔ اور انہی دلیلوں سے علماء روم نے فتویٰ دیا ہے۔ ہندوستان کے کٹھ مُلّا اگر تعصب سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ تو اس کا کیا علاج ہے بعد اس کے کتاب فتوح المصر اور فتوح الشام کھولی۔ اس میں لکھا تھا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ طلائی لباس حاکم بعلبک کا پہنے ہوئے تھے۔ پھر کیمیائے سعادت نکالی، اُس کے رکن سوم میں لکھا ہوا تھا کہ جناب سلطان الانبیاء صلعم کے واسطے کفار جو کپڑا ہدیہ بھیجتے۔ آپ اُسے بھی پہن لیتے صحابہ کبار بھی جو کپڑا کفار کی لُوٹ میں پاتے بے تکلف پہن لیتے۔

ایک صاحب حاضرین میں سے بول اُٹھے۔ کہ جب ہندوستان کے بہت لوگ متفق ہو جاوینگے تب قدیم لباس چھوڑا جاویگا۔ ورنہ قدیم چال چھوڑنی لازم نہیں۔

صاحب خانہ نے کہا کہ حضرت ہزار عاقل تو ایک بات پر متفق ہو جاتے ہیں مگر جاہل دو بھی ایک بات پر متفق نہیں ہوتے۔ ہندوستان میں تو ہمات باطلہ بہت ہیں ممکن نہیں کہ ایک مدت پر گو وہ کیسی ہی اچھی ہو چند شخص متفق ہو جاویں۔ ایک زمانہ تھا کہ کھڑکی دار پگڑی اور گھیردار جامہ اور گھیتلہ جوتے کا رواج تھا پھر نیمہ بھی پہننے لگے اور رنگ برنگ کے چیرے اور لپیٹواں پتیاں باندھنے لگے۔ پھر دوپلڑی ٹوپی اور چھ کلیا انگرکھا اور غرارہ دار پاجامہ شروع ہوا کسی کمیٹی نے یہ لباس نہیں شروع کیا تھا۔ کسی ایک شخص نے اُس کو جاری کیا دیکھا دیکھی سب کرنے لگے مگر جو لوگ جامہ اور نیمہ پہننے کے عادی تھے۔ وہ ان لوگوں کو ہزاروں نام رکھتے تھے اور بُرا بھلا کہتے تھے۔ پھر چند روز کے بعد انہیں جامہ پہننے والوں نے اس لباس کو پہنا اور اُن کی اولاد نے تو بالکل اُسی کو اختیار کر لیا۔ اب اگر کوئی جامہ پہنکر نکلے تو لڑکے تالیاں بجا کر پیچھے پڑ جاویں۔ میرا لباس دیکھئے کہ اگرچہ ہندوستانی لباس سے کسی قدر فرق ہے مگر انگریزی قطع کا بھی نہیں ہے صرف قدیمی لباس میں کسی قدر ترمیم کی ہے۔ خفتان ایک قدیمی لباس ہے اُس کا طول نصف قد کی برابر رکھتا ہوں کلیاں چوبغلہ بدستور ہندوستانی قطع کا ہے۔ اکثر حصہ

میں صدری کا ساز لگا ہوا ہے۔ بعض میں بٹن ہیں۔ اور بعض پلیٹ دار ہیں۔ دونوں طرف سینہ پر اور پشت پر دو انچ چوڑی پلیٹ ہے یہ خاص ترکوں کا ایجاد ہے۔ اور کمر کی پیٹی بھی ترکوں کا دستور ہے اور پاجامہ معمولی وضع کا ہے۔ بار یک کپڑا بسبب نفوذ کرنے سرد وگرم ہوا کے انسان کے لئے مضر ہے۔ اِس لئے عفت کپڑا کی پوشاک بناتا ہوں جاڑے میں بانات اور کشمیرہ کا لباس پہنتا ہوں ؞

سوال۔ ہندوستان میں جو لباس مروّج ہیں اُس میں کیا بُرائی ہے اور اس میں تبدیل اور تہذیب کی کیا ضرورت ہے ؞

جواب۔ آپ کو گاڑی اور رتھ کے بدلے جھٹ اور بگھی رکھنے اور ڈیوٹ اور فتیل سوز کے بدلے لمپ اور فانوس جلانے کی کیا ضرورت ہے صرف اُن کی عمدگی کے سبب سے تبدیل کی گئی ہے۔ پس لباس کے تبدیل کرنے کی بھی یہی ضرورت ہے۔ ڈھیلا لباس آدمی کو چیست نہیں رکھتا۔ اور جاڑے میں رضائی یا دوشالہ میں لپیٹ کر آدمی آدمی نہیں رہتا بلکہ ایک گٹھری ہو جاتا ہے ؞

مہمان نے کہا کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ اونچا لباس اور چیست سب طرح سے اچھا ہوتا ہے۔ سواری شکاری میں بھی فائدہ دیتا ہے۔ مگر یہ تو فرمایئے کہ چھری کانٹے سے کھانے کی کیا ضرورت ہے بلکہ خلاف سنّت ہے اور ہاتھ سے کھانا سُنّت ہے ؞

جواب۔ ہاتھ سے کھانا سنت موکدہ نہیں ہے جس کے ترک میں گناہ ہو۔ آپ ہزاروں کام سنت موکدہ کے خلاف کرتے ہیں۔ اور کچھ خیال بھی نہیں کرتے مگر ہاتھ سے کھانے کی سنت آپ کو یاد ہے۔ جناب پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاں چالیس چالیس روز تک چھوارہ اور پانی کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ جَو کی بغیر چھنے آٹے کی روٹی اکثر نوش فرماتے تھے۔ مگر آپ روزمرہ قورمہ اور پلاؤ اور متنجن بریانی۔ مزعفر فیرینی وغیرہ مرغن کھانے نوش فرماتے ہیں کبھی مسنون کھانا کھانے کا خیال نہیں آتا۔ مگر کھانے کے مسنون طریقہ پر بحث ہوتی ہے۔ اور وہی ٹھیک مثل آپ پر صادق آتی ہے۔ جو حامی اسلام سید احمد خاں نے کہی ہے کہ کھانے فرعونی اور طریقہ مسنونی ایک طرف دس انگریز ایک طرف دس مسلمان اور ایک طرف دس ہندو کھانا کھانے کو بٹھا دو کہ اپنے اپنے طریق پر کھاویں اور تمہارے دل میں جو باتیں سمائی ہوئی ہیں اُن کو تھوڑی دیر کے واسطے

علیحدہ طاق میں رکھدو اور مورخوں کی آنکھ سے بلا تعصب دیکھو کہ تینوں قوموں میں سے کس کے طریقہ میں نفاست اور صفائی ہے میرے تین دوست ایک انگریز کے یہاں مہمان ہوئے ایک اُن میں سے سر گھٹے ہوئے مولوی صاحب بھی تھے۔ انگریز اپنی میز کرسی پر اور یہ تینوں اس کے سامنے فرش پر بیٹھے اور کھانا کھانا شروع کیا۔ مولوی صاحب کے ہاتھوں پر شوربا بہنے لگا۔ اور وہ بار بار چاٹنے لگے۔ یہ دیکھکر وہ انگریز پہلے تو ہنسا آخر اُس کو اس قدر گھن آئی کہ کھانا چھوڑ کر کمرہ سے باہر نکل گیا۔ جیسا آپ ہندوؤں کو ننگے بدن چوکے میں بیٹھا دیکھ کر اُن کی طرز خورش پر حقارت سے ہنستے ہیں۔ ایسا ہی انگریز ہم لوگوں کے کھانے کے طریقہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور اُس پر ہنستے ہیں۔ اور کھانے والوں کو گنوار کہتے ہیں *

مہمان نے کہا یہ تو آپ نے سچ فرمایا کیونکہ جب کئی مسلمان باہم کھانا کھانے بیٹھتے ہیں۔ تو اُن میں سے بعضے ایسے غلیچے پن سے کھاتے ہیں۔ جس کو دیکھکر نفرت آتی ہے۔ انگلیاں شوربہ سے بھرتی جاتی ہیں اور وہ چاٹتے جاتے ہیں۔ پلاؤ میں شوربہ ہاتھ سے ملاتے ہیں۔ اور اُسی لتھڑے ہوئے ہاتھ سے اُس کو کھاتے ہیں۔ چاروں انگلیوں سے فرنی کے سڑپے بھرتے ہیں۔ جی تو چاہتا ہے۔ کہ میں بھی چھُری کانٹے سے کھایا کروں مگر لوگوں کے بُرا کہنے سے ڈر لگتا ہے *

جواب۔ یہ آپ کا خیالی ڈر ہے۔ لوگوں کا یہ دستور ہے کہ پہلے تو ایک شخص پر ہنسا کرتے ہیں۔ پھر آپ بھی ویسے ہی ہو جاتے ہیں *

سوال۔ انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانا کیسا ہے؟ *

جواب۔ انگریزوں کے ساتھ کھانا خدا اور رسُول کے حکم سے جائز ہے۔ قرآن شریف میں صاف حکم موجود ہے۔ طعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم اور خود جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے مسماۃ زینب یہودیہ کی دعوت کھائی جس نے گوشت میں زہر ملایا تھا۔ چنانچہ اُس زہر کے اثر نے بہت [illegible] تکلیف جناب رسالت مآب کو دی اور بھی یہودیوں نے دعوت کی ہے۔ اور آنحضرت صلعم نے قبول فرمائی ہے اور جب کبھی جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور اپنے عہد خلافت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اہل کتاب یعنی یہود یا نصاریٰ سے صلح کرتے۔ تو شرائط صلح میں یہ شرط بھی اُن سے قبول کراتے کہ جو کوئی مسلمان اُن کے یہاں جاوے۔ اُس کی مہمانی اور عزت کیا کریں۔ حضرت

ابوبکر صدیق کے عہد خلافت میں جب حاطب بطور ایلچی کے مقوقس بادشاہ مصر کے پاس گئے جو نصرانی تھا۔ اور دستر خوان بچھایا گیا۔ اور اُس پر سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا چُنا گیا اور سب کھانے پر بیٹھے تو حضرت حاطب سے کہا گیا کہ تم بھی کھانے میں شریک ہو اُنھوں نے انکار کیا۔ تب بادشاہ نے مسکرا کر کہا کہ میں جانتا ہوں۔ جو تم پر حلال ہے۔ اس لئے سوائے گوشت پرندوں کے کوئی اَور چیز حرام ہم تم کو نہ کھلاوینگے حاطب نے جواب دیا کہ میں سونے چاندی کے برتنوں میں نہیں کھاتا اللہ تعالے نے اُن کا وعدہ ہم سے جنت میں کیا ہے۔ پس بدل دیا انہوں نے کھانا مٹی کے برتنوں میں اور حضرت حاطب نے کھایا اور ہمیشہ سے ہمارے سلطان روم اور خدیو مصر اور شاہ ایران اور اُن کے امراء اور رعایا ہر کوئی اہل کتاب یعنی انہیں انگریزوں اور یہودیوں کے ساتھ کھاتے ہیں اور کچھ پرہیز نہیں کرتے ÷

سوال۔ اہل کتاب اس زمانہ میں سؤر کا گوشت کھاتے ہیں اور شراب پیتے ہیں تو پھر کیونکر ہم اُن کے ساتھ کھا سکتے ہیں ÷

جواب۔ یہ کوئی بات نہیں ہے اہل کتاب اُن چیزوں کا استعمال پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی کرتے تھے۔ اور اُن کے استعمال کی وجہ سے اُن کے ساتھ حلال چیزوں کا کھانا جائز نہ ہوتا تو قرآن شریف میں اُن کے کھانے کی حلت کا حکم نازل نہ ہوتا اور جناب رسالت مآب کبھی کسی یہودی یا نصرانی کی دعوت قبول نہ فرماتے۔ اب ہندوستان میں بھی جاٹ وغیرہ بعض ہندو قومیں سُور کھاتی ہیں۔ اور کایستھ کثرت سے شراب پیتے ہیں۔ اور ہندو گائے کا پیشاب بھی پاک سمجھ کر پی لیتے ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی مسلمان اُن کے گھر کا اور اُن کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے میں کچھ بھی کراہت نہیں کرتا ÷

سوال۔ میں نے سنا ہے کہ جوتا پہنے نماز پڑھنا گناہ ہے اور آپ بوٹ پہنے بیٹھے ہیں۔ کیا اسی طرح آپ نماز بھی پڑھ لیتے ہیں۔ آپ نے کس سے سُنا ہے کہ جوتا پہنے نماز پڑھنا منع اور گناہ ہے لوگوں کی زبانی سُنا ہے ÷

جواب۔ آپ نے رواجی مسلمانوں کی زبانی سُنا ہوگا جو احکام دین پر رسم و رواج کو مقدم سمجھتے ہیں۔ دُر مختار میں صاف لکھا ہے مسجد میں جانے والے کو چاہئے کہ اپنے جوتہ کو دیکھ بھال لے کہ کہیں نجاست سے آلودہ تو نہیں ہے اور جوتہ اور موزہ پہنکر نماز پڑھنا بشرطیکہ وہ طاہر ہوں افضل ہے۔ اور وجہ افضلیت کی یہ ہے کہ طبرانی نے ایک حدیث اس مضمون کی روایت کی ہے کہ جوتوں کو پہنکر

نماز پڑھو اور یہود کی مشابہت مت کرو وہاں شامی نے البتہ لکھا ہے کہ جوتا پہنکر مسجد میں
جانا اس زمانہ کے عرف میں داخل بے ادبی ہے اور مسجد کے فرش کی آلودگی کا خوف ہے ۔
مگر یہ فرمایئے کہ جناب پیغمبر خدا صلعم کا حکم واجب التعمیل ہے یا شامی اور عراقی کا رشامی
دُرمختار کا شارح ہے ۔ اگر اُس نے اپنی رائے یا زمانہ کا دستور لکھدیا ۔ تو وہ اصل شریعت
کا حکم نہیں ہو سکتا اس دستور کے قایم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جناب پیغمبر صاحب کے زمانہ
میں عرب میں فرش بچھانے کا دستور نہ تھا ۔ مگر جب مسلمان عرب سے باہر نکلے اور شام اور
مصر اور ایران فتح کیا تو اپنی پرانی طرز معیشت کو چھوڑ کر اچھے لباس پہننے اور عمدہ فرش
مکانوں میں بچھانے لگے ۔ اُس فرش کو صاف رکھنے کے لحاظ سے پیادہ پھرنے کے بعد جوتا
اُتار کر فرش پر آنے اور بیٹھنے کا دستور ہو گیا ۔ وہی دستور مسجد میں بھی جاری ہو گیا مگر خلفائے
بنی اُمیہ کے ہاں اس کا رواج نہیں ہوا ۔ اُن کے روبرو جوتا یا موزہ اُتار کر جانا بے ادبی
میں داخل تھا مجھ کو آپ دیکھتے ہیں کہ اس کمرہ میں فرش ہے اور قالین بھی بچھا ہے ۔
جس پر میں بوٹ پہنے بیٹھا ہوں ۔ جب نماز کا وقت آتا ہے تو اسی طرح بوٹ پہنے ہوئے
نماز پڑھ لیتا ہوں ؂

مہمان نے کہا اب مجھ کو یقین ہوا کہ جو کچھ عرف عام میں مشہور ہے محض غلط ہے اور
وجہ اس غلطی کی یہی ہے کہ لوگ علم دین سے ناواقف ہیں ۔ توہمات میں پھنسے ہوئے ہیں ۔
مگر اب اکثر کتابیں اردو میں ہوتی جاتی ہیں ۔ تو مولوی صاحب کی بھی ضرورت گھٹتی جاتی
ہے ۔ اب تو میں بھی ایسا ہی کرونگا ۔ کہ مکان پر جوتا پہنے نماز پڑھا کرونگا لیکن مسجد میں
رعایت علم کی وجہ سے جوتا اوتار دیا کروں گا ۔ تاکہ جاہل تکرار نہ کریں ۔ میں نے کہا کہ بعض
ناخواندہ جاہل اس قدر متعصّب نہیں ہوتے ۔ جس قدر کہ لکھے پڑھے جاہل متعصّب
ہوتے ہیں ؂

سوال ۔ یہ تو فرمایئے کہ انگریز مہذب اور ہندوستانی نامہذب کیوں کہلاتے ہیں ؂

جواب ۔ اس بات کی تحقیق نہایت آسان ہے ایک ایسے انگریز اور ہندوستانی کے گھر
میں جاکر دیکھو جو یکساں عمدہ رکھتے ہوں یا برابر تنخواہ پاتے ہوں تو تم انگریز کے بنگلہ میں دیکھو گے
کہ بنگلہ کے تمام اطراف نہایت صاف ہیں احاطہ کے دروازہ سے برانڈہ تک عمدہ سڑک بنی
ہوئی ہے ۔ ایک چھوٹا سا چمن لگا ہوا اور خوشنما روشیں اور بٹریاں ہیں ۔ بنگلہ کے اندر ہر

کمرہ میں نہایت صاف اور اچھا فرش بچھا ہے ۔ جس غرض کے لئے جو کمرہ ہے ۔ اُس میں اُسی قسم کا ساز و ساماں مہیا ہے ۔ میزیں اور کرسیاں اور الماریاں اور شیشہ آلات سب اپنے اپنے موقع سے سجی ہیں ۔ بچہ اور ان کی آیا نہایت صاف اور اُجلا لباس پہنے ہیں ۔ کھانے کے وقت کھانے کی میز نہایت خوشنمائی اور صفائی سے آراستہ ہوگی ۔ جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ۔ خانساماں ۔ خدمتگار ۔ کوچوان یہانتک کہ سائیس اور خاکروب تک لباس اور وردی سے ٹھیک اور درست ہونگے ۔ ہتھیار اور سواری ۔ غرضیکہ ہر ایک چیز نہایت نفیس اور صاف ہوگی اور ہندوستانی کے یہاں ہر چیز بر عکس اسکے خراب اور میلی اور ابتر پاؤگے ۔ جس کی تفصیل کرنا مناسب نہیں ۔

سوال ۔ یہ تو آپ نے صحیح فرمایا انگریز نہایت صفائی سے عمدہ طرز پر رہتے ہیں ۔ گویا دنیا کی زندگی کا لطف انہیں کو حاصل ہے مگر یہ تو فرمایئے کہ ہندوستانی انگریزوں کو دیکھتے ہیں ۔ پھر کیوں نہیں صفائی سے زندگی بسر کرتے ۔

جواب ۔ خدا تعالے نے انسان میں ایک قسم کی خود بینی پیدا کی ہے ۔ جس کے سبب سے ہر ایک شخص اپنی ہر ایک بات کو گو وہ کیسی ہی بُری کیوں نہ ہو پسند کرتا ہے اور دوسروں کی باتوں کو گو وہ کیسی ہی اچھی کیوں نہ ہوں ۔ اچھی نہیں جانتا دیکھو حبشی اپنے کالے رنگ موٹے ہونٹ ۔ بھیڑ کے سے بالوں کو عمدہ اور خوبصورت سمجھتا ہے ۔ میں آپ کو ایک مثال سے اسی بات کو سمجھاتا ہوں آپ قوم ڈھیر کے لوگوں کے پاس جایئے جو بالکل غیر مہذب بلکہ وحشی ہیں اور اُن کو سمجھایئے ۔ کہ تم پھوس کے نہایت خراب جھونپڑہ میں رہتے ہو ایک لنگوٹی باندھے ہو اسباب خانہ داری تمہارا نہایت خراب ہے زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھے ہو ۔ اس سبب سے تمہارا بدن میلا ہے ۔ تم کو چاہیئے اچھا مکان بناؤ اچھے کپڑے پہنو اپنی اولاد کو علم پڑھاؤ پاک صاف رہو تو وہ لوگ آپ کی ان باتوں کی ہنسی اڑا دینگے ۔ اور سمجھینگے کہ آپ کو جنون ہو گیا ہے اور یہ جواب دینگے کہ ہماری موجودہ حالت بزرگوں سے ایسی ہی چلی آتی ہے یہی بہت اچھی ہے ۔ اگر آپ اُن کی طرز معیشت اور دستوروں کی کچھ برائیاں بیان کرینگے تو آپ کو دھکے اور گالیاں دیکر نکال دینگے کچھ بھی نہیں سُنیں گے ۔ مگر اُنہیں میں سے ایک نوجوان ڈھیر کو پولیس میں کانسٹبل مقرر کر دو اور اُس کو اردو لکھنا پڑھنا حسب دستور پولیس کے سکھاؤ ۔ تو اُس کو وردی کے پہنے رہنے سے چند روز میں تنگے

پھرنے کی عادت چھوٹ جاویگی اور کچھ ضابطہ فوجداری بھی یاد کرلیگا۔ اس کے بعد وہ ہیڈ ہو جاوے یہانتک کہ انسپکٹری کے عہدہ پر ترقی پاوے اور کچھ انگریزی پڑھ لے تب اُس سے آپ دریافت کریں کہ جب ہم تمہارے گھر تم کو سمجھانے گئے تھے۔ تو تم اور تمہارے بھائی برادر اپنی موجودہ حالت کو اچھا بتلاتے تھے۔ اور اب تم عمدہ لباس پہنتے ہو۔ عمدہ اسباب رکھتے ہو۔ عمدہ مکان میں رہتے ہو۔ اور اب کہو کیا کہتے ہو تو آپ یقین فرماویں کہ وہ ضرور کہیگا کہ مجھ کو اُس وقت عقل اور تمیز نہ تھی۔ میرے اہل برادری سب احمق اور جاہل ہیں۔ وہ حالت کسی طرح اچھی نہیں ہو سکتی۔ عمدہ حالت یہی ہے۔ جو اب میری ہے۔ اب میرا ارادہ ہے۔ کہ مال کا قانون یاد کرکے تحصیلداری کا امتحان دوں۔ صاحب کلکٹر میری کارگذاری سے نہایت خوش ہیں فوراً تحصیلدار کردینگے۔ اور اُمید قوی ہے۔ کہ پھر چند روز میں ڈپٹی کلکٹر ہو جاؤں گا۔

مہمان نے کہا کہ فی الواقع یہ مثال تو آپ نے بہت ہی ٹھیک بیان کی۔ بیشک یہ جہالت اور نادانی کا سبب ہے۔ جو ہم اچھی باتوں کے حاصل کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ اور اپنی موجودہ خراب حالت کو اچھا جانتے ہیں۔

میں نے کہا کہ تمام مسلمان ترک روم اور شام اور مصر اور ٹونس وغیرہ کے مدت سے بیدار ہو چکے ہیں۔ اور ملکوں کے مسلمان بھی بیدار ہوتے جاتے ہیں۔ مگر ہندوستان کے مسلمانوں کا حال کمال افسوس کے قابل ہے۔ کہ یہ خواب غفلت میں پکی نیند میں پاؤں پھیلائے سوتے ہیں۔ پرچہ تہذیب الاخلاق اُن کو جگاتا ہے۔ مگر جیسے سوتا ہوا غافل آدمی جگانے والے سے ناراض ہو کر لاتیں مارتا ہے بڑبڑاتا ہے۔ اُن کے بھی جو کچھ منہ میں آتا ہے بکتے ہیں۔ مگر آنکھیں نہیں کھولتے۔ ہاں جن لوگوں کی نیند بہت غفلت کی نہیں تھی۔ وہ بیدار ہو کر کوشش کرنے لگے ہیں۔ اور اوروں کو جگاتے ہیں۔

مضمون مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب

ریویو

منشی محمد ذکاء اللہ صاحب کا لکھا ہوا

کیا مبارک دن عید کا یکم شوال ۱۳۱۵ نبوی اور ۱۲۸۷ ہجری تھا۔ کہ ایک دانشمند باغبان نے اپنے دست مبارک سے ہماری قوم کے لئے اس سرزمین ہند میں تہذیب الاخلاق کا وہ بیج بویا کہ پہلے کبھی نہ بویا گیا تھا۔ اور اُس کی آبیاری ایسی جانفشانی سے کی۔ کہ وہ جلدی سے زمین میں سے پھوٹا۔ اور سبز کونپلیں اور ہرے پتے جھٹ پٹ نکل آئے اِدھر شگوفے کھلکر گُل ہوئے اُدھر ہزاروں بلبلوں کے جمگھٹ اُس پر جمع ہوئے۔ اور اُنہوں نے اپنے شیریں نغموں کا ایسا شور اور غلغلہ مچایا کہ وہ لوگ جو خواب غفلت میں ایسے پڑے سوتے تھے۔ کہ خواب بھی نہیں دیکھتے تھے۔ جاگ اُٹھے۔ اور اِس نغمہ سرود سرائی کے سُننے میں ایسے دل وجان سے مصروف ہوئے کہ پھر اُن کو خواب غفلت نہ آیا۔ اِدھر کانوں کے لطف کا یہ سامان ہورہا تھا کہ اُدھر زبان کی چکھوتیوں کے لئے اُس درخت کے نورس پھل بھی آموجود ہوئے اِن پھلوں میں وہ مزہ تھا کہ جن کی زبان کا ذائقہ برسوں سے بگڑا ہوا تھا۔ اُن کو بھی ایسی لذّت آتی تھی۔ کہ کبھی اُن کا جی نہ بھرتا تھا یہ سب کچھ تھا۔ مگر جس سرزمین میں یہ درخت لگا تھا وہ پتھریلی تھی۔ اور وہاں صرصر اور طوفان باد بھی اکثر آیا کرتے تھے۔ اس لئے درخت کے سرسبز اور شاداب رکھنے میں باغبان کو مشقت شاقہ اُٹھانی پڑتی تھی۔ ہر وقت تردد اور تفکّر رہتا تھا۔ کہ کسی طوفان کے جھٹکے میں میرا یہ پلا پلایا نونہال نہ آجاوے۔ آخر کار اپنی تجربہ کار پیرانہ سال دوراندیشی سے باغبان کو یہ خیال آیا کہ میں کب تک اس پتھریلی زمین میں اپنے درخت کو تروتازہ اور سیراب رکھوں گا۔ اور طوفان باد سے بچانے کے لئے جیوں گا۔ بہتر ہے کہ میں خود ہی اس درخت کو جڑ سے اکھیڑوں

اور اُس کو سکھاؤں۔ اور اُس کی نایاب لکڑی کو اپنی قوم میں تقسیم کر دوں۔ اور وہ کاریگری اور
صناعی بتلا دوں۔ کہ جس سے نہایت کام کی خوبصورت چیزیں تراش تراش کر بنائیں اور
اُس سے فائدہ اور حظ اٹھائیں۔ سوائے اس کے درخت کے بیج بھی ایسے پھیل گئے ہیں۔
کہ اور باغبان اُن کو لگا کر اپنی قوم کو اس سے متمتع کرینگے۔ غرض اُس نے یہ سوچ کر کہ اگر
میں نہ رہا تو کون اس لکڑی کی سڈول چیزیں بنانی سکھائیگا اس کے کاٹنے کا قصد کیا تاکہ
جو درخت سے پورے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ وہ سب اُس کی قوم کو حاصل ہوں۔ غرض کہ
خدا تعالیٰ وہ دن کرے کہ یہ باغبان اپنے منصوبوں کا ثمرہ دیکھے اور اپنے درخت کی لکڑی کی
سڈول تراشی ہوئی چیزوں سے اپنی قوم کو آراستہ پاوے۔ جس وقت کہ یہ نرالا بیج یہاں بویا گیا
تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا کیا رنگ ہوگا اور وہ کیسے پھل پھول لاویگا۔ اور کیسے شگوفے
کھلاویگا۔ مگر اب تو وہ ماشاء اللہ سات برس کا ہرا بھرا پھولا پھلا درخت کھڑا ہے اہل نظر اس
کے برگ و بار کی کیفیت بتلا سکتے ہیں۔ اور کہہ سکتے ہیں کہ اُس سے کیا کیا ثمرے پیدا ہوئے اور
انہوں نے کن کن شیریں زبانوں کے کام و دہان کو شکر سے پُر کیا۔ اور کن تلخ کاموں کو وہ حنظل
سے زیادہ کڑوی معلوم ہوئی۔ اُس کے رگ و ریشہ کس کس طور سے لوگوں کے دلوں میں پھیلکر
مضبوط جڑ پکڑ گئے۔ اور اس کی ڈالیاں کہاں کہاں پھیلیں۔ ان سب باتوں کے دیکھنے کی مجھے
فرصت نہیں ہے۔ مگر میں تو فقط یہ دیکھتا ہوں۔ کہ اس کے سایہ تلے اُردو زبان کے علم انشاء
نے کیونکر نشو و نما پایا۔ اور خیالات لوگوں کے کیونکر اُس کے پھلوں کے کھانے سے پروردہ
ہوئے۔ اگرچہ یہ دو باتیں مختلف رنگ کی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ ہمرنگ ہیں۔
اس لئے کہ خیالات میں اور الفاظ میں ایک قدرتی پیوند ہے۔ کہ وہ جدا نہیں ہو سکتا خیالات
ہی الفاظ کو زبان سے نکالتے ہیں۔ اور الفاظ ہی خیالات پیدا کرتے ہیں۔ وہ ایک ہی
چیز ہے۔ کبھی دماغ میں ہوتی ہے کبھی زبان میں۔ وہ زبان سے نکلتی ہے دماغ میں جاتی ہے
اور دماغ سے نکلتی ہے زبان پر آتی ہے۔ خلاصہ اس اوپر کی تقریر کا یہ ہے۔ کہ ہر قوم کا علم
ادب اور انشاء اُس قوم کے خیالات اور اخلاق کا آئینہ ہوتا ہے۔ جب کوئی قوم پستی کے گڑھے
میں گرتی ہے۔ اور عیش و عشرت اور کاہلی اور سستی کے نشہ میں مست ہوتی ہے۔ تو اُس
کے سارے علم ادب میں بُری باتیں رچ جاتی ہیں۔ چنانچہ جب سے ہندوستان میں اہل
اسلام کا تنزل شروع ہوا ہے۔ تو اُن کی زبان کے سارے علم ادب کی کتابوں میں سوائے

عاشقانہ غزلوں۔ واسوختوں۔ مدحیہ قصیدوں۔ ہجو کے قطعوں۔ بے سود قصہ و کہانیوں کی مثنویوں کے کچھ اور نہیں۔ ساری ہمت شاعرانہ اور جودت اور ذہانت طبع انہیں مضامین میں صرف ہوتی ہے۔ رات دن انہیں میں تلاش مضمون رہتی ہے۔ شائد کوئی کتاب ہزل اور رفث سے خالی ہوگی جس میں عورتوں کے طعنے مہنے اور لونڈوں کی گالم گلوچ نہ ہوگی۔ جن کمبخت خانہ خراب نوجوانوں کو ان مضامین میں لطف آجاتا ہے وہ تو مجنوں بن قیس و فرہاد کو بھی عشقبازی میں مات کرنا چاہتے ہیں۔ سوائے اسکے اخلاق کے بد ہو جانے کے سبب سے جن الفاظ کا مفہوم نیک بھی ہوتا ہے۔ اُس کے لئے بھی معنی تازہ وہ گھڑ لئے جاتے ہیں۔ کہ جن سے اُن کا مفہوم بھی بد ہو جاتا ہے۔ ہزاروں الفاظ جن کے معنے ستھرے اور پاک تھے۔ اس اخیر زمانہ میں غلیظ اور ناپاک معنی میں مستعمل ہونے لگے۔ مثالیں سینکڑوں ہیں۔ چند اُن میں سے لکھی جاتی ہیں +

حضرت۔ شیطان کو کہتے ہیں۔ ولی اللہ اور معصوم بیوقوف اور سادہ لوح کہلاتے ہیں۔ مہتر۔ بھنگی کا نام ہے خلیفہ۔ حجام اور درزی کا لقب ہے۔ پاکباز۔ سبزی چھاننے کی صافی کہلاتی ہے۔ مولوی پڑھے ہوئے جن کہلاتے ہیں۔ تہذیب الاخلاق کا نام تخریب الاخلاق رکھا گیا ہے اب اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں کہ یا تو نکوکاری سے ایسی نفرت لوگوں کو ہو گئی ہے کہ وہ الفاظ کے معنے متبرک اور مقدس کو بھی نہیں دیکھ سکتے۔ یا ریاکاری اور مکاری اُن میں ایسی بڑھ گئی ہے کہ جو حضرت بنتے ہیں وہ شیطان ہی ہوتے ہیں۔ جو ولی اللہ اور معصوم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ احمق ہی ہوتے ہیں۔ غرض اخلاق اور علم ادب کی ترقی اور تنزل ساتھ ساتھ ہوتی چلی آئی ہے۔ جو لوگ رموز زبان سے آشنا ہیں وہ ان باتوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ اب ہم بالتفصیل لکھتے ہیں۔ کہ اس تہذیب الاخلاق نے ان دونوں باتوں میں کیا کیا اپنے اثر دکھائے اور اُن کے کیا کیا ثمرے اور نتیجے عمل میں آئے +

اوّل۔ جو بڑا اس نے کام کیا۔ اور حقیقت میں وہ بڑا ہی کام ہے۔ وہ یہ ہے کہ مغربی خیالات کو مشرقی زبان میں اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ اُن کی حسانت اصل سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ بعض فاضلوں کی یہ رائے ہے کہ اردو زبان میں یہ قابلیت ہی نہیں کہ مغربی خیالات اُس میں سمائیں۔ اب اس پرچہ نے خود اس کام کو کر کے دکھلا دیا کہ مغربی خیالات خواہ کسی قسم کے ہوں وہ سب اُردو زبان میں ادا ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ کوئی ادا کرنیوالا لائق اور قابل ہو۔ سید احمد خاں صاحب ہیں۔

ایک استعداد اور ملکہ خداداد ایسا ہے کہ وہ ان مغربی خیالات کو اپنی زبان میں اس خوبی اور بے تکلفی سے ادا کرتے ہیں۔ اور اپنی جودت طبع اور عالی دماغی سے کوئی اصلاح یا کوئی بات ایسی زیادہ کر دیتے ہیں کہ وہ مضمون مغربی زبان سے زیادہ تر شگفتہ اور متین ہو جاتا ہے۔ مشرقی خیالات پہلے اپنے زمانہ میں بڑی قدر و منزلت رکھتے تھے مگر آجکل وہ ذلیل اور ارذل سمجھے جاتے ہیں اور اجیرن معلوم ہوتے ہیں جو اُن میں مشغلہ رکھتے ہیں وہ اپنی حماقت کو بڑھاتے اور عقل کو گھٹاتے ہیں۔ اس لئے اس ملک میں بڑی ضرورت اس امر کی تھی۔ کہ کوئی ذخیرہ مغربی خیالات کا ایسا جمع ہو کہ اُس سے سرمایہ دانش حاصل ہو سو اس پرچہ کی بدولت سات جلدیں جن کے قریب دو ہزار صفحہ ہونگے نہایت عمدہ کاغذ پر نفیس ٹیپ، کے چھاپہ کی موجود ہیں۔ اور ان میں بہت سے مضمون خیالات مغربی سے بھرے ہوئے ہیں۔ اُن کے سبب سے ہندوستانی اخبار والوں اور خانگی خط و کتابت کی اور تصنیف کتابوں کی طرز تحریر میں بڑا فرق ہو گیا ہے۔ اب تک بندی سے لوگ ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں اور بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے کلموں سے مضامین کی گردن نہیں توڑتے۔ بیہودہ استعارات اور تشبیہات کی چھری سے اردو کا خون نہیں کرتے۔ شوکت الفاظ سے حشمت معنی نہیں دکھاتے پہلے جو اس کے عادی تھے کہ الفاظ کے پھولوں کو انھوں نے گونتھا گانٹھا۔ کبھی اُس کا سہرہ بنا لیا کبھی ہار کبھی بدھی غرض رہی معمولی دس پانچ چیزیں بنائیں کچھ دیر اُن کو دیکھ کر دل خوش کر لیا اور کچھ خوشبو سونگھ کر دماغ کو معطر کر لیا پھر تھوڑی دیر کے بعد دیکھا تو وہ اُس سڑی ہوئی بُو کے کچھ نہ تھا۔ غرض کہ لوگوں نے الفاظ کی لال مینا اُڑانی چھوڑ دی ہے۔ اور مضمون نگاری پر توجہ کی ہے اور سیدھی سادی سلیس عبارت عام پسند اختیار کی ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا۔ کہ ہم کوئی اخبار یا خط یا کوئی کتاب ایسی نہ دیکھتے ہوں۔ کہ اس پرچہ کی تحریر کا پرتو نظر نہ آتا ہو بعض برملا اقرار کرتے ہیں۔ کہ ہم سید احمد خانی تحریروں سے مستفیض اور مستفید ہوئے جو ایسے مضمون لکھتے ہیں بعض ہٹ دھرمی کرتے ہیں۔ اگر کوئی میری تحریر میں کوئی خوبی بتلائے تو اُسے بھی کہہ دیں کہ میں نے وہ انہیں سے حاصل کی ہے۔ ایک گروہ ان تحریروں کا مخالف ہے۔ مگر قاعدہ ہے کہ جس وقت کوئی سیدھی اور سیدھی راہ پر رہنمائی کرتا ہے تو گمراہ اس کے مخالف ہوتے ہیں۔ مگر آخر کار خود بھی اُسی پر چلنے لگتے ہیں۔ ہم کو یقین واثق ہو گیا ہے۔ کہ سب آخر کو اس پرچہ کی طرز تحریر کو اختیار کر لیں گے۔

دوسرا فائدہ پہلے اس پرچہ کے نکلنے سے کوئی یہ بھی جانتا تھا کہ قوم کا مفہوم کیا ہے۔ اور وہ کیا ہوا کرتی ہے۔ قومی ہمدردی۔ قومی عزت۔ قومی محبت و مودت۔ قومی بھلائی۔ قومی خوشی

نہ یہ الفاظ خود اور نہ اُن کے مترادف اُردو زبان میں موجود تھے۔ کہ جن سے معلوم ہوتا کہ یہ بھی کوئی چیز ہیں یہاں کے انسانوں میں ہوتی ہیں اِس پرچہ کا کوئی نمبر کیا شاید کوئی مضمون خالی ان عمدہ باتوں سے نہیں۔ اُن مضامین کے ادا کا بہد ھا اور صاف طریقہ اختیار کیا گیا اور اُس پر تاثیر زبان میں بلاغت اور فصاحت کے ساتھ ادا کیا گیا کہ وہ لوگوں کی خاطر نشان اور دل نشین ہوگئی سینکڑوں دل اس قومی جوش سے بھر گئے اخباروں کے اخبار قومی مضامین سے پُر ہو گئے۔ خانگی خط و کتابت میں سلسلہ وار تحریریں انہیں مضامین کی ہونے لگیں کہیں شریف اور بھلے مانس دس پانچ جمع نہ ہوتے ہونگے۔ کہ وہاں اس قومی ہمدردی کا ذکر نہ کرتے ہونگے۔ کوئی ٹرین ایسی نہ ہوگی جو اس ذکر سے خالی جاتی ہوگی۔ اس پرچہ کے فقرے بہت سی ضرب المثلیں آج کے زمانہ میں بن گئیں۔ ہر کس و ناکس کے منہ پر وہ چڑھ گئیں۔ اور وہ قومی مقولے بن گئے جن کی حکومت لوگوں کے دلوں پر بادشاہوں کے فرمان سے زیادہ ہے جس انجمن کی تحریر و تقریر کو سنئے وہ گویا تہذیب الاخلاق ہی کی نقل معلوم ہوتی ہے۔ جس شخص نے کوئی کار خیر کسی مجمع میں کرنا چاہا اُس نے قومی مضمون کو چھیڑ دیا۔ اور اس کام کا سرانجام بخیر ہو گیا۔ آجکل اُس کے الفاظ اور فقروں نے وہ کام کیا ہے کہ بڑے بڑے آدمیوں سے ہونا مشکل تھا۔ جہاں جہاں ترکوں کے یتیموں اور بیواؤں اور زخمیوں کے لئے انجمن چندہ مرتب ہوئیں اور صاحب دل اور منصف تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہوا اُدھر اُس نے اس پرچہ کے دو چار فقرے لفظاً یا معناً بیان کئے اُدھر ہزاروں روپیہ کے توڑے بھرنے شروع ہوئے۔ اور لاکھوں آنسو ٹپکنے لگے جس وقت ہم اُس پر غور کرتے ہیں۔ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس پرچہ نے فقط یہیں کے آدمیوں کو فائدہ نہیں پہنچایا بلکہ بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچایا۔ ہزاروں زخموں پر مرہم رکھا۔ سینکڑوں اندھوں کی آنکھوں کو روشنی پہنچائی۔ بہت سے بے دست پاؤں کو بادست و پا کیا۔ مریضوں کو دوا کی بھوکوں کو غذا دی۔ ننگوں کو پوشاک پہنائی۔ درماندوں کو آسائش و آرام دیا۔ عورتوں کی عصمت و عزت کا محافظ بنا۔ یتیموں کا مربی ہوا اور کیا کیا لکھوں کہ اُس نے کیا کیا۔ کیا انصاف کسی میں ہو تو دیکھے۔ آجکل جو مسلمان ترکوں کی خیروں کیلئے گلی گلی کوچے کوچے اُسی طرح پھر رہے ہیں جس طرح کہ بمبئی اور مدراس میں بھوکے روٹی کے لئے۔ اور اُن کی ہزیمت سے رنج اور اُن کی نصرت سے مسرت کرتے ہیں۔ یہ بات کس نے سکھائی ہے۔ کبھی کسی نے یہ قومی جوش پیدا کیا تھا۔ یہ سارا کام اسی پرچہ تہذیب الاخلاق کا ہے جس وقت یہ قومی عزت و جوش و ہمدردی کا چرچا مسلمانوں میں اس پرچہ نے پھیلایا تو ہمارے ہموطن بھائیوں ہندوؤں کو بھی اپنی قوم کا خیال

پیدا ہوا اور انہوں نے مجلسیں اور جلسے ایسے جا بجا شروع کئے۔ کہ جن سے قوم کی بھلائی ہو۔
اوّل انہوں نے اپنے مجمعوں میں سید احمد خاں کی جے پکاری اور دہائی مچائی۔ کہ ہمارے ہم میں کوئی
سید احمد خاں نہیں۔ چندروز کا عرصہ گذرا ہے کہ الہ آباد میں ایک بڑے لائق عالم و فاضل پنڈت
نے یہ بیان کیا کہ ہم مسلمانوں سے دولت میں کہیں زیادہ ہیں۔ علم میں بہت بڑھ کر ہیں۔ تعداد
میں اُن کو ہم سے کچھ نسبت نہیں۔ مگر ہائے افسوس صد افسوس ہم میں سید احمد خاں کوئی نہیں
ایک ہم میں کیا سید احمد خان نہیں۔ اگر ہم بیس بھی ملیں تو بھی سید احمد خاں نہیں بن سکتے اس بیان
کو ایسی شدومد کی آواز سے انہوں نے ارشاد کیا تھا۔ کہ اب تک اُس کی تاثیر ہمارے کانوں سے
نہیں گئی۔ اب آپ بتلایئے۔ کہ اس مجلس غیر اسلام میں کس چیز نے اس اعزاز کے ساتھ تمام
سید احمد خاں کا کہلایا۔ وہ اسی پرچہ نے سید کی تمام قومی ہمدردی کا اظہار اسی پرچہ کی بدولت
ہوا ہے۔ جو سچ بولتے ہیں اور سچ کو سچ سمجھتے ہیں اُن کے سامنے بول ہی اور جو جھوٹ بولتے
ہیں۔ اور سچ کو مشکل سے سمجھتے ہیں۔ اُن کے سامنے قسم کھا کر میں یہ کہتا ہوں کہ قومی عزت قومی
محبت و مواسات کے خیالات جو ہندوستان میں لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوئے ہیں۔ وہ
سید احمد خاں ہی کے اقوال اور افعال سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان خیالات ہی کے پیدا
ہونے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاید ہماری قوم کی فصل بہار آنے والی ہے*

سوئم۔ نیچر (فطرت) کے مضامین جو اس پرچہ میں درج ہوئے اُن سے لوگوں نے جانا کہ
ہاں مضمون نگاری اس کا نام ہے۔ جو بیان کہ دل کے اندر تاثیر کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ
یہی ہے۔ انسان کے خیالات کے مخرج کو اور اُن سے جو خوشیاں حاصل ہوتی ہیں۔ اُن کے فرق
کو بھی بتلاتا ہے۔ جذبات انسانی کا مصوّر بھی ہے۔ گو قافیہ سنجوں نے اپنی عادت کے موافق
اوّل اوّل اُس کا قافیہ کیچڑ باندھ دیا تھا۔ مگر تھوڑے دنوں بعد وہ سمجھ گئے کہ جو کچھ ہے یہی
ہے۔ پھر تو وہ بھی نظم میں نیچر کے میدان میں قدم رکھنے لگے اور مضامین عشقیہ اور خیالیہ سے
ہاتھ اُٹھانے لگے۔ اس لفظ کو اوّل اوّل لوگوں نے اس پرچہ کی بدولت ہی سُنا تھا۔ اسی لئے
پہلے تو گھبرائے۔ مگر جب سمجھے کہ وہ کیا ہے۔ اور اس کے سبب سے بیان میں کیا شگفتگی اور
تاثیر پیدا ہوتی ہے تو پھر قایل ہو گئے۔ اور اُن اپنی بیہودہ تحریروں کو چھوڑنے لگے کہ جن
کے اندر دو صفحے کیا دو سطریں بھی نہ ہوتی تھیں۔ کہ ایک اَن نیچرل (بر خلاف فطرت) کوئی مضمون
نہ ہو۔ سینکڑوں آدمی ایسے ہو گئے ہیں۔ کہ ایسے مضامین سے اُن کو غثیان ہوتا ہے تو اب

تو کبھی اپنی طرز تحریر کو چھوڑیں گے۔ لیکن بوڑھے مجبور ہیں۔ کہ وہ کیونکر اپنی خلاف وضع اختیار کریں اور وہ اختیار بھی نہیں کر سکتے مجبور ہیں ؛

؛ **چہارم**۔ باہمی ارتباط اور اتحاد اور ملاقات اور معاشرت میں جو برائیاں تھیں اُن کو بتایا اور سمجھایا کہ سچی محبت اور موانست کبھی پیدا نہیں ہو سکتی جبتک آپس میں ہمسری اور آزادی نہ ہو۔ پھر طریقہ آزاد خیالات بنانے کا بتایا۔ اور عوام الناس میں اُس قوت کے پیدا کرنے کی تدبیریں بتائیں کہ جس سے وہ عمدہ کاموں کی قدر کر سکیں اور وہ دل اس نے پیدا کر دیئے کہ جن کو قومی اتحاد کا شوق اور ترقی کا دورہ زمانہ حال کے موافق دامنگیر ہو (مولوی مہدی علی اور مولوی فریدالدین اور مولوی سمیع اللہ خاں کو جو پہلے جانتے تھے اور اب جانتے ہیں میرے قول کی تصدیق کریںگے) اس کے سوا جو اُس نے بڑا کام کیا وہ یہ ہے کہ اہل اسلام کا جو طریقہ حکام کے ساتھ ملنے جلنے کا منافقانہ تھا اس کی بیخ کنی میں جہاں تک ممکن تھا کوشش کی۔ قاعدہ ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم کی محکوم ہو جاتی ہے تو محکوم قوم کی عزت اور آبرو اسی قدر بڑھتی جاتی ہے جس قدر کہ وہ شائستگی میں علم و فضل و لیاقت میں حاکم قوم کے ساتھ مماثلت اور مشابہت پیدا کرتا ہے اور اتنی ہی محبت بڑھتی جاتی ہے جتنی کہ وہ مبانت کو تاہے مسلمانوں نے کا ئیتوں کی کیوں قدر کی؟ اسی سبب سے پس مسلمان جس قدر کہ ان باتوں میں انگریزوں کی تقلید کرینگے اُتنی ہی عزت اور آبرو حاصل کرینگے کیونکہ تقلید ایک سچی خوشامد ہوتی ہے جو سب کو پسند آتی ہے۔ اور جتنا حاکموں سے منافقانہ برتاؤ کرینگے اور اُن کی سی لیاقت نہ پیدا کرینگے اپنی عزت کھوئینگے۔ اور خاک مذلت پر لوٹیں گے اور دین و دنیا دونوں کو رو بیٹھیں گے۔ جب اہل اسلام کے دو فقرے حاکموں کے کانوں تک پہنچتے ہیں کہ کافروں کے ساتھ موالات انسانی چاہیئے۔ اور موانست قلبی نہیں چاہیئے۔ تو اُن کو یقین ہو جاتا ہے کہ کوئی سچا مسلمان ہمارا ہوا خواہ نہیں ہو سکتا ہے۔ پس جب حاکم کا یہ خیال محکوم کی نسبت ہو تو کیسا اس کے حق میں مضر ہے۔ مگر الحمدللہ کہ سید احمد خاں کی تحریروں نے بہت سے مسلمانوں کے دل سے ان نفاق آمیز باتوں کو دور کیا اور احکام کو بھی سمجھایا کہ یہ نفاق مذہب اسلام میں داخل نہیں ہے ؛

؛؛ **پنجم**۔ اس نے تمام زمانہ گذشتہ کی سرگذشتوں کو خوب کھنگالا اور حال کی حالت بد کو بتلا کر شرمندہ کیا اور استقبال کی بہبودی و بہتری سے دل و جان کو تقویت دی۔ اس نے تمام اہل اسلام کی برائیوں کو نہایت سچی محبت اور دلسوزی اور پیار سے بیان کر دیا اور سمجھا دیا کہ جو محب اسلام اپنی محبت قلبی کے سبب سے عیوب اہل اسلام کو چھپاتے ہیں اور ظاہر کرنے والوں سے

ہشت مشت کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ وہ ایسے زخم کو نہاں کرتے ہیں۔ کہ جو آئندہ ناسور بن جائیگا اور خاک میں پنہاں کر دیگا۔ یہ محبت ایسی نادان ماؤں کی ہے۔ کہ جو اپنے بچوں کی برائیاں چھپا چھپا کر اُن کو بدمعاش بنا دیا کرتی ہیں۔ اور پھر آپ ہی روتی ہیں۔ غرض کہ اُس نے سب امراض اہل اسلام اور اُن کے علاج حکیمانہ بتلا دیئے ٭

ششم جب تہذیب قومی کے مضامین لکھے ناگزیر مسائل مذہبی کی بحث آن پڑی اور بمجبوری اُن سے گزیر نہ ہو سکی۔ اِن بحثوں کو اُس نے نہایت خوبی اور بردباری اور عجیب غریب مذاق سے نباہا۔ جو بحث کہ طوالت کے سبب سے بے لطف ہونے لگی اُسے چھوڑ دیا ٭

ہفتم ۔ شائستہ اور مہذب قوموں میں بعض الاکابر علماء اور حکماء کی خواہ تعصب کے سبب سے یا غلطی رائے کے سبب سے یہ رائے ہے کہ اسلام ایسا مذہب ہے کہ اہل اسلام میں اُس کے سبب سے اعلےٰ درجہ کی شائستگی پیدا ہو سکتی تھی۔ پھر جس جوانمردی اور عمدہ دلائل سے اُس نے اُن بڑے بڑے لائق آدمیوں کی دلیلوں کو رد کیا ہے۔ اُس کی تعریف میں نہیں کر سکتا ٭

ہشتم ۔ مسلمانوں کی بڑی بدنصیبی اور کمبختی تھی۔ کہ اُن کے دلوں میں انگریزی زبان اور علم کی تحصیل سے وحشت ایسی بیٹھ گئی تھی۔ کہ وہ کوسوں اُن سے بھاگتے تھے۔ اپنے علوم اور زبان کی تعصب کی جڑیں ایسی مضبوطی سے اُن کے ذہنوں میں پھیل گئی تھیں۔ کہ اُن کا اکھڑنا آسان کام نہ تھا۔ مگر الحمدللہ۔ کہ اس کام میں یہ پرچہ ایسا کامیاب ہوا کہ کسی اور کام میں نہیں ہوا۔ اُس نے پشاور سے لے کر راس کماری تک سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں سے اس وحشت اور تعصب کا بالکل استیصال کر دیا ٭

پس اب میں اس امر پر اپنے مضمون کا خاتمہ کرتا ہوں۔ کہ یہ ایک مخزن اور ذخیرہ اُردو زبان کے علم ادب میں ایسا ہے۔ کہ اُس کے مضامین قسم وار جدا جدا ہو کر چھاپے جائیں۔ اور تمام ہندوستان کے درس اور تدریس میں جاری ہوں۔ اور اُن مضامین کو قسم وار تقسیم کرنے والا اپنے اوپر یہ امر واجب اور فرض جانے کہ ایک دیباچہ اُن مضامین کے اوّل لکھے۔ جس میں وہ یہ بات ثابت کرے کہ سید احمد خان بانی تہذیب الاخلاق مذہب اسلام میں مجتہد اور امام ہے اور دنیا کے کاموں میں دانشمند اور فرزانہ دور اندیش ہے علم حکمت میں حکیم ہے علم اخلاق میں مورلیسٹ (علم اخلاق کا جاننے والا) ہے۔ اور قدرتی علم ہیں

نیچرلسٹ (عالم علم قدرت) ہے۔ زبان دانی میں ایک نئی اردو کا موجد ہے۔ اس کی طرز تحریر جدید ہے۔ اخلاق میں خوش طبعی اور خوش طبعی میں اخلاق اس طرح سے ملایا ہے کہ ایک گنوار سے لے کر عالم تک اس سے لطف اٹھاتا ہے۔ زبان کی وسعت دینے کے طریقے ایسے جانتا ہے۔ کہ آج تک کوئی اس کے برابر نہیں ہوا۔ میر مومن ایک کہانی اور سودا اور میر قصائید اور مثنویاں لکھ گئے اگر اس میدان میں آن کر کھڑے ہوتے تو ضرور سید کے قدموں پر گرتے۔ جس خوبصورتی سے انگریزی الفاظ کو اردو زبان میں ملایا ہے۔ اس سے زبان کو مرصع بنا دیا ہے۔ یہ سارا مجموعہ اردو زبان کا شکسپیر اور بیکن کے مضامین اس نے بنا دیا ہے۔ اس سے دین و دنیا دونوں کا فائدہ اٹھ سکتا ہے۔ روزمرہ کی گفتگو جو بڑے کلمات اور بد محاورات اور ناپاک قسموں اور برے کوسنوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کو درست کرتا ہے۔ جن تعصبات اور خیالات بد کی خاک سے ہمارے دلوں کے چشمے آٹے پڑے ہیں۔ ان کو نکوکاری کے پانی سے صاف کرتا ہے۔ اب خدا سے دعا ہے کہ جس مہربان قبلہ و کعبہ نے ہمارے لئے یہ سب کچھ کیا ہے۔ دنیا میں خوش حال رہے۔ اور جب تک اس کی ساری دلی تمنائیں پوری ہوں ہمارے سر پر زندہ رہے اور ہم کو بھی توفیق دے اور دل و دماغ کو ایسا بنا دے۔ کہ جو کچھ وہ ہماری دنیا و عقبیٰ کے لئے کرے۔ اس کو ویسا ہی سمجھیں۔ جیسا کہ ہم کو سمجھنا چاہئے +

آمین ثم آمین

حسب ضابطہ رجسٹری شدہ ہے

(کتبہ حکیم محمد امین قریشی فاروقی سلہو کے ضلع گوجرانوالہ)